تلافی



ناول رزاق شاہد کوہلر

تلافی

حالات نہایت ہی خراب تھے۔خاص کر امن وامان کی صورتِ حال تو نا قابلِ بیان تھی۔دن دیہاڑے اغوا برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگ، بم بلاسٹ، اور خودکش حملوں کی وارداتیں ہورہی تھیں، جب کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بسی کی زندہ تصویر بنے ہوئے تھے۔اخبارات کی سُرخیاں چیخ رہی تھیں۔الیکٹرانک میڈیا پر اینکر پرسن واویلا مچا رہے تھے لیکن حکمران محض بیانات داغ رہے تھے۔وہ اب بھی اُن آہنی ہاتھوں کے حوالے دے رہے تھے جو آج تک کسی مجرم کے گریبان تک نہیں پہنچ سکے تھے اور نہ آئندہ پہنچنے والے تھے کہ انھیں عوام سے زیادہ اپنی تجوریاں عزیز تھیں۔

ایسے حالات عام پبلک کے لیے بلاشک وشبہ نا موافق ہوتے ہیں۔اُنھیں جان ومال کا خطرہ ہوتا ہے۔وہ ڈرڈر کر جیتے ہیں تو کبھی جیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔صبح سے لے کر شام اور شام سے لے کر صبح تک وہ اپنے چاروں طرف موت کی آہٹ محسوس کرتے رہتے ہیں۔مگر جرائم پیشہ لوگوں کے لیے یہ آئیڈیل صورت حال تھی اور اس آئیڈیل صورت حال سے وہ خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔لوگ جب سہمے ہوئے ہوں تو جُرم کرنا نہ صرف آسان ہوجاتا ہے بلکہ جُرم کرتے ہوئے مجرم کو لطف بھی آتا ہے۔سو اُن دنوں جرائم پیشہ گروہ خوب انجوائے کر رہے

تھے۔شہر کے حالات اس قدر مخدوش ہو چکے تھے کہ شہریوں کا زندگی پر سے اعتبار اُٹھ چکا تھا۔رات تو رات لوگوں نے دن کے وقت بھی گھروں سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا لیکن بدن سے سانسوں کا رشتہ بحال رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے اور کچھ کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ ہر روز پندرہ بیس جنازے اُٹھنا معمول بن چکا تھا مگر لوگ تھے کہ ہر روز مرنے کے لیے باہر آ جاتے تھے۔شاید اُنھیں بھوک سے مرنے کی بجائے گولی سے مرنا زیادہ آسان لگتا تھا۔بھوک سسکا سسکا کر مارتی ہے جب کہ گولی پل بھر میں زندگی کے غموں سے آزاد کر دیتی ہے۔چنانچہ لوگ زندگی کے غموں سے نجات پانے کے لیے روز مر رہے تھے۔

عامر شفیق عامی نے اپنی مجرمانہ زندگی کا آغاز اسٹریٹ کرائم سے کیا تھا۔لوگوں سے موبائل فون، نقدی اور موٹر بائیک وغیرہ چھین لینا اُس کا پیشہ تھا۔آگے پیچھے کوئی تھا نہیں اس لیے اُس کے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ویسے اُس نے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔اس کے بعد جونہی والدین کا سایا اُس کے سر سے اُٹھا وہ شترِ بے مہار کی طرح گاؤں سے بھاگا اور سیدھا کراچی جا کر دم لیا۔

کراچی میں پہلے پہل تو اُس نے عام لوگوں کی طرح محنت مزدوری کر کے رزق حلال کمانے کی کوشش کی مگر جلد ہی اُسے یہ احساس ہو گیا کہ ایک میٹرک پاس شخص کے لیے کراچی جیسے شہر میں باعزت طریقے سے کمانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور دوسرا اُس پر یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ یہاں شرافت راس نہیں آتی۔تب وہ متبادل راستا ڈھونڈتے ہوئے جُرم کی دنیا میں داخل ہو گیا۔چونکہ بندہ جی دار تھا اس لیے جلد ہی اپنے قدموں پہ کھڑا ہو گیا۔شکل وصورت اور قد کاٹھ کا بھی اچھا تھا۔ہمیشہ کسی ایکشن فلم کے ہیرو کی طرح ایک مخصوص گیٹ اپ میں رہتا تھا۔دن دیہاڑے کسی بھی شخص کو بیچ چوراہے پہ لوٹ کر اپنی ہیوی موٹر بائیک پہ بیٹھ کر منٹوں میں نکل جاتا تھا۔قانون کے آہنی ہاتھ آج تک اُس کے گریبان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔کراچی شہر میں اُس جیسے ہزاروں تھے جو اسٹریٹ کرائم میں ملوث تھے اور پولیس کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

پانچ چھ ماہ تو وہ اکیلے ہی وارداتیں کرتا رہا، پھر بقول شاعر لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا کے مصداق اُس نے اپنا گینگ بنا لیا۔چھے افراد پر مشتمل اس گینگ کا لیڈر وہ خود تھا۔گینگ کے لوگ اُسے باس تو کبھی عامی اُستاد کہتے تھے۔گینگ بنا تو وہ اسٹریٹ کرائم کے ساتھ ساتھ پٹرول پمپس اور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز وغیرہ بھی

لوٹنے لگے۔ عامی اُستاد نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے چند پولیس افیسرز کو بھی رام کرلیا تھا۔ ان پولیس والوں کو ہر واردات کے بعد باقاعدہ نذرانہ پہنچایا جاتا تھا۔ کراچی کے جس علاقے میں اُن کی رہائش تھی، وہاں کا پولیس اسٹیشن تو اُن کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا۔ تھانہ انچارج انسپکٹر اسلم کرمانی اور عامی اُستاد کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ انسپکٹر اسلم کرمانی اُس پر بے حد مہربان تھا۔ عامی جب کبھی بھی فارغ ہوتا تھا تو گپ شپ لگانے کے لیے انسپکٹر اسلم کرمانی کے پاس چلا جاتا تھا۔

اُس روز عامی اپنے گینگ سمیت فلیٹ میں موجود تھا۔ وہ سب بے حد خوش تھے اور پینے پلانے کا دور چل رہا تھا۔ نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے وہ آپس میں نہایت ہی فحش گفت گو کررہے تھے۔ ابھی دو دن قبل ہی اُنھوں نے ایک پٹرول پمپ لوٹا تھا۔ اس ڈکیتی میں کافی تگڑا مال اُن کے ہاتھ لگا تھا۔ لہٰذا اسی خوشی میں وہ پی کر جشن منا رہے تھے۔ عامی اُستاد ایک پیگ چڑھانے کے بعد دوسرا پیگ سامنے لیے بیٹھا تھا کہ ایسے ہی وقت اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے بُرا سا منہ بنا کر کال کرنے والے کو ایک ناقابلِ اشاعت گالی دیتے ہوئے جیب سے سیل فون نکال کر سکرین پر نظر ڈالی تو وہاں انسپکٹر اسلم کرمانی کا نام جھلملا رہا تھا۔ شور مچاتے اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اُس نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے کال ریسیو کی تو اسلم کرمانی نے بغیر علیک سلیک کے پوچھا۔ ”کہاں ہو یار تم سے ایک ضروری کام آپڑا ہے۔“

”اپنے فلیٹ پر ہوں۔“ وہ قدرے حیران ہوگیا۔ ”کیسا کام؟“

”تم بس فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ، میں شدت سے تمہارا منتظر ہوں۔“ انسپکٹر نے حکمیہ انداز میں جواب دیا۔

”کچھ پتا تو چلے جناب! آخر بات..................“

”عامی! تم میرا وقت ضائع کررہے ہو۔“ انسپکٹر کرمانی نے جھنجھلا کر قطع کلامی کی۔ ”جو میں نے کہا ہے اُس پر عمل کرو، ہر بات فون پر بتانے والی نہیں ہوتی۔ بس فوراً پولیس اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرو۔“

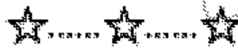
”اوکے میں پہنچتا ہوں۔“ کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر بولا۔ ”یہ کرمانی حرامی ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے۔ میں ذرا پولیس اسٹیشن تک جا رہا ہوں، تم میں سے کوئی بھی فلیٹ سے باہر نہ نکلے۔“

"باس! کیا میں بھی ساتھ چلوں؟" صفدر نے سوال کیا، وہ عامی اُستاد کا رائیٹ ہینڈ تھا۔

"نہیں یار! اُس نے صرف مجھے بلایا ہے۔" عامی اُستاد نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم لوگ مزے کرو، میری قسمت میں تو شاید بے آرامی ہی لکھی ہے۔"

"اوکے باس جیسے آپ کی مرضی، لیکن ذرا سنبھل کر رہنا پولیس والوں کی دوستی کبھی کسی مجرم کو راس نہیں آتی۔" صفدر نے مخدوش انداز میں جواب دیا۔

عامی اُستاد کمرے سے باہر نکلا اور سیدھا اپنی ہیوی موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس کی موٹر بائیک پولیس اسٹیشن کی طرف اُڑی چلی جارہی تھی جب کہ وہ انسپکٹر کرمانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نجانے اُس پر کون سی افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ صفدر کا خدشہ بھی اُس کے دماغ میں چکرا رہا تھا کہ پولیس والوں کی دوستی کبھی کسی مجرم کو راس نہیں آتی۔ مگر عامی اُستاد کا دل کہتا تھا کہ انسپکٹر کرمانی ایسا نہیں ہے۔ وہ دوست بن کر دھوکا نہیں دے گا۔



ظہیر احمد صدیقی نے اپنے سامنے ٹیبل پر بکھری فائلیں سمیٹ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی تو تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ آفس کا سارا عملہ جاچکا تھا سوائے چپڑاسی شکور کے جو ایک چوبی اسٹول پر بیٹھا اُس کے اُٹھنے کا شدت سے منتظر تھا۔ شکور کی بے چینی اُس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی مگر وہ آفس کے ہیڈ کلرک ظہیر صدیقی کو وقت پر چھٹی کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ صدیقی نہایت ہی ایمان دار انسان تھا۔ وہ ہمیشہ آفس کا کام نمٹا کر ہی چھٹی کرتا تھا۔ سو اکثر لیٹ ہوتا رہتا تھا۔ وہ پچپن کے پیٹے میں تھا اور کچھ عرصے کے بعد ریٹائر ہونے والا تھا۔

صدیقی صاحب نے وال کلاک سے نظر ہٹا کر شکور کی طرف دیکھا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "بھئی شکور! میں آج پھر تم سے شرمندہ ہوں کہ کوشش کرنے کے باوجود وقت پر کام نہ نمٹا سکا۔"

"کوئی بات نہیں سر! ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اب تو میں اس بات کا عادی ہو چکا ہوں۔" شکور نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے جواب دیا اور پھر دل ہی دل میں بولا۔ "سالا بڈھا کھوسٹ مرتا بھی نہیں، روزانہ کتنے لوگوں کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ نصف درجن بوری بند لاشیں بھی ملتی ہیں۔ پتا نہیں اس کا نمبر کب

لگے گا؟"

صدیقی صاحب نے کہا۔"شکور! یہ تو تمہارا بڑا پن ہے۔ورنہ آج کل کون کسی کی سنتا ہے؟سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ایمان دار لوگ تو اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔چاروں طرف بے ایمان ہی بے ایمان ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ بندہ جائے تو جائے کہاں؟"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر۔"شکور نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا البتہ دل میں بولا۔"یا اللہ! تو اپنے اس ایمان دار بندے کو اپنے پاس بلا لے تو بدلے میں تیرا یہ بے ایمان بندا داتا دربار پر بریانی کی دیگ چڑھائے گا اور وہ بھی بکرے کا گوشت ڈال کر۔"

"نہیں شکور۔"اس نے نفی میں سر ہلایا۔"آئندہ اگر مجھے دیر ہو جایا کرے تو تم نکل جانا، میں خود ہی آفس بند کر لیا کروں گا۔"

شکور نے کہا۔"جیسے آپ کا حکم سر۔"پھر دل میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوا۔"یا اللہ! مجھے معاف کر دینا میں یہ ڈیل کینسل کر رہا ہوں، تجھے تو معلوم ہی ہے کہ میری تنخواہ نہایت ہی قلیل ہے۔بریانی کی دیگ میں پوری تنخواہ نکل جائے گی۔"

"او کے۔"صدیقی صاحب نے سیٹ چھوڑتے ہوئے کہا۔"میں اب چلوں گا۔تم تالے وغیرہ سنبھال کر آفس بند کر لو، کھڑکیاں ضرور چیک کر لینا۔"

"بے فکر رہیں سر! پہلے کبھی مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے کہ اب ہوگی؟"شکور نے عجلت میں کھڑکیوں کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

ظہیر صدیقی آفس سے باہر نکلا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا جہاں اُس کی موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔یہ موٹر سائیکل اُس نے پندرہ برس قبل خریدی تھی جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ اب تک اُس کا ساتھ نبھا رہی تھی۔اُس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور پارکنگ ایریا سے نکلتا ہوا کھلے روڈ پر پہنچ گیا۔اُس کا گھر آفس سے ایک گھنٹے کی مسافت پر شہر کی گنجان آبادی میں واقع تھا۔راستے میں ایک تندوری سے اُس نے چھ عدد گرم گرم روٹیاں خریدیں، اُنھیں موٹر سائیکل کے سیف گارڈ سے لٹکایا اور دوبارہ روانہ ہو گیا۔گھر تک پہنچے

پہنچتے اُسے چار بج گئے۔ دروازہ اُس کے اکلوتے بیٹے عماد احمد نے کھولا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل برآمدے میں جا کر روک دی اور پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''سوری بیٹے! میں آج پھر لیٹ ہو گیا۔ یقیناً بھوک سے تمہارا بُرا حال ہو گا۔''

عماد بولا۔ ''بے شک بھوک تو ہے مگر مجھے آپ کے بغیر کھانا کھانے کا لطف نہیں آتا۔''

''ٹھیک ہے تم یہ روٹیاں لے جا کر ٹیبل پر لگاؤ، میں ابھی سالن گرم کر کے لاتا ہوں۔'' وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

کچن میں ایک درمیانے سائز کا فریج موجود تھا۔ اُس نے فریج کھول کر سالن نکالا اور چولھا جلا کر سالن گرم کرنے لگا۔ جب سالن گرم ہو گیا تو اُس نے دو پلیٹوں میں سالن ڈالا اور عجلت میں کمرے کی طرف چل دیا۔ تب تک عماد ٹیبل پر روٹیاں اور پانی کا جگ لگا چکا تھا۔ دونوں کھانا کھانے میں لگ گئے۔ گذشتہ دس برسوں سے اُن دونوں کا یہی معمول تھا۔ عماد کی امی کو فوت ہوئے دس برس بیت چکے تھے۔ چنانچہ پچھلے دس برسوں سے ظہیر صدیقی نے کچن سنبھال رکھا تھا۔ عماد نے ایم ایس سی تک تعلیم حاصل کی تھی مگر تا حال بے روزگار تھا۔ وہ روزانہ دفاتر کے چکر کاٹا رہتا تھا مگر قسمت کی دیوی اُس پر مہربان نہیں ہو رہی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہمیشہ کی طرح ظہیر صدیقی نے اپنا من پسند ٹاپک چھیڑ دیا۔ ''عماد! تم اگر شادی کر لو تو میری اس کچن کے عذاب سے جان چھوٹ جائے گی۔ میں اب تھک چکا ہوں بیٹے۔''

عماد بولا۔ ''ابو مجھے اس کا احساس ہے مگر میں کیا کروں...... آپ جانتے ہیں کہ میں فی الحال شادی افورڈ نہیں کر سکتا۔ ابھی تو میں آپ کا محتاج ہوں، بیوی کی ذمہ داری کیسے اور کس طرح سنبھالوں گا؟''

''بیٹے! شادی کو روزگار کے ساتھ نتھی مت کرو، رزق دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ کیا وہ بے روزگاروں کو رزق نہیں دیتا۔ کبھی کوئی بے روزگار بھوکا سویا ہے؟''

''نہیں ابو۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جب تک میں اپنے قدموں پہ کھڑا نہیں ہو جاتا تب تک میں شادی نہیں کروں گا اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔''

''میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ پھر تجھے کس بات کی فکر ہے؟''

''بے شک آپ کا سب کچھ میرا ہی ہے مگر میں پھر بھی شادی نہیں کروں گا۔ بہتر ہو گا کہ آپ اب اس

موضوع کو چھیڑا ہی نہ کریں۔"

"کہیں تم کسی کو پسند تو نہیں کرتے؟" اچانک اُس نے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

"نن...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ ایکدم بوکھلایا مگر پھر فوراً سنبھل گیا۔"پسند ناپسند والی بات تو تب ہوگی جب میں اپنے قدموں پہ کھڑا ہو جاؤں گا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟" اُس نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

"یہ محض آپ کا وہم ہے۔ میں بھلا کوئی بات آپ سے کس طرح چھپا سکتا ہوں؟ آپ کے علاوہ اور کون ہے میرا اپنا جس پر میں اعتماد کر سکوں؟"

"گڈ مجھے تم سے یہی اُمید تھی بیٹے! کہ تم مجھ سے کبھی کوئی معاملہ مخفی نہیں رکھو گے۔"

"بے فکر رہیں ابو! میں کبھی بھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔"

"اوکے تو پھر کیا خیال ہے ایک ایک کپ چائے کا ہو جائے؟" اُس نے موضوع بدل کر پوچھا۔

"بالکل...... مگر آج چائے میں بناؤں گا ابو، آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ تھوڑی دیر ریسٹ کر لیں۔" وہ اُٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

عماد کے جانے کے بعد وہ اُٹھا اور بک شیلف سے اپنی پسند کی ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ مطالعے کا اُسے اسکول کے زمانے ہی سے شوق تھا جو اَب تک باقاعدگی سے چلا آ رہا تھا۔ ہر مہینے تنخواہ لینے کے بعد وہ چند اچھی کتابیں خریدنا نہیں بھولتا تھا۔ تاہم عماد کو کتابیں پڑھنے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ بھی نوجوان نسل کی طرح انٹرنیٹ کا دیوانہ تھا اور اکثر ٹائم کمپیوٹر کے سامنے گزارتا تھا۔ فیس بک پر اُس کے بے شمار دوست تھے۔ جن میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے دوستوں سے چیٹنگ کرتا رہتا تھا۔

☆......☆......☆

عامی اُستاد نے موٹر بائیک تھانے کے احاطے میں روکی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا انسپکٹر کرمانی کے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ کوارٹر اُس کا دیکھا بھالا تھا۔ اکثر وہیں اسلم کرمانی کے ساتھ اُس کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بلا جھجک اُس کمرے میں داخل ہو گیا جسے انسپکٹر کرمانی نشست گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کمرے کے اندر

انسپکٹر کرمانی اکیلا نہیں تھا۔ وہاں ایک اجنبی شخص بھی موجود تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ عامی اُستاد پر نظر پڑتے ہی اجنبی کے چہرے پر شناسائی کی چمک اُبھر کر معدوم ہوگئی جب کہ انسپکٹر کرمانی بولا۔ ''آؤ یار! ہم تمہارے ہی انتظار کر رہے تھے۔''

''میں اتنا اہم کب سے ہوگیا ہوں کرمانی! کہ آپ جیسے آفیسر لوگ بھی میرا انتظار کرنے لگے ہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور پھر اُن دونوں سے باری باری مصافحہ کرنے کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

کرمانی بولا۔ ''پہلے ان سے ملیے، یہ سلیمان پاشا صاحب ہیں اس شہر کے مشہور و معروف بزنس مین اور سیاست دان۔ تم نے یقیناً ان کا نام سُن رکھا ہوگا؟''

وہ بولا۔ ''نام تو سنا ہے لیکن ملاقات کا شرف پہلی بار حاصل ہو رہا ہے۔''

کرمانی نے کہا۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ پاشا صاحب نے تمہیں نہ صرف ملاقات کا شرف بخشا ہے بلکہ تمہارے لیے ایک ایسا کام لے کر آئے ہیں کہ تم دنوں میں کروڑ پتی ہو جاؤ گے۔ تو پھر کیا خیال ہے پاشا صاحب کا کام کرو گے یا نہیں؟''

''کرمانی صاحب! کام کی نوعیت جانے بغیر میں بھلا کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں؟''

کرمانی نے کہا۔ ''ڈونٹ وری کام تمہاری مرضی کا ہے اور کام کا معاوضہ تمہاری توقع سے بہت زیادہ ہے۔''

''پھر بھی کچھ پتا تو چلے کہ کس طرح کا کام ہے؟'' اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' کرمانی نے اثبات میں سر ہلایا اور سنٹرل ٹیبل پہ پڑا ہوا بریف کیس کھول کر پانچ پانچ ہزار روپے والے نوٹوں کی دو عدد گڈیاں نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ پورے دس لاکھ روپے ہیں اور یہ اُس کام کا معاوضہ ہے جو تمہیں پاشا صاحب کے لیے کرنا ہے۔''

''لیکن کام تو آپ نے ابھی تک..........''

''میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔'' کرمانی نے قطع کلامی کی اور بریف کیس سے ایک تصویر نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اس شخص کو زندگی کی قید سے آزاد کرنا ہے۔ یہ شخص پاشا صاحب کا جانی دشمن ہے اور کبھی بھی موقع پا کر پاشا صاحب پر جان لیوا حملہ کر سکتا ہے اس کا مکمل ایڈریس تصویر کے پیچھے

درج ہے۔"

عامی اُستاد نے اُس کے ہاتھ سے تصویر لے کر بغور اُس کا جائزہ لیا اور پھر بولا۔"شکل سے تو یہ ایک عام سا شریف انسان لگتا ہے۔آپ شاید مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہیں؟"

"کرمانی ٹھیک کہتا ہے۔"سلیمان پاشا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔"شکل سے یہ بے شک شریف لگتا ہے مگر حقیقت میں یہ ایک غنڈا ہے اور مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے۔ایک بار یہ مجھ پر وار کر چکا ہے، وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں بال بال بچ گیا ورنہ اس نے تو مجھے ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

وہ بولا۔"پاشا صاحب! یقیناً آپ سچ کہہ رہے ہوں گے لیکن میں نے آج تک کسی انسان کی جان نہیں لی۔میں مانتا ہوں کہ میں ایک بُرا انسان ہوں لیکن کسی انسان کو قتل کرنے کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

"نہیں سوچا تو اب سوچ لو۔"پاشا کی بجائے کرمانی نے کہا۔"تمہیں اس شخص کو جلد از جلد ٹھکانے لگانا ہے۔"

"نہیں کرمانی! مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔"اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔"کرمانی سمجھانے والے انداز میں بولا۔"کب تک یہ چھوٹی موٹی ڈکیتیاں کرتے رہو گے؟ کسی دن کسی گارڈ کی گولی کا نشانہ بننے سے بہتر ہے کوئی مردوں والا کام کرو۔دس لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہے ورنہ اس شہر میں تو بیس بیس ہزار روپے پر بھی کلرز دستیاب ہیں۔پاشا صاحب تو کسی کو بھی ہائر کر سکتے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی غیر متعلق شخص کی بجائے میرے دوست کو فائدہ پہنچے۔"

"کرمانی! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں لیکن قتل جیسی واردات کرنے سے میں قاصر ہوں۔"اُس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"لیکن میں جو پاشا صاحب کو زبان دے چکا ہوں، اُس کا کیا ہوگا؟ ان کے بہت احسان ہیں مجھ پر۔" کرمانی نے پہلی بار قدرے سختی کا مظاہرہ کیا۔

"میں مجبور ہوں کرمانی صاحب۔"اُس نے کمزور سا احتجاج کیا۔"ورنہ پہلے کبھی آپ کو انکار کیا ہے؟"

"تمہاری طرح میں بھی مجبور ہوں۔اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔اگر تم انکار کرو گے تو بات بگڑ جائے گی اور بہت نقصان ہوگا۔"کرمانی نے ڈھکے چھپے انداز میں دھمکی دی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کرمانی کی ذات اُس کے لیے ناگزیر تھی۔ وہ کرمانی سے تعلقات بگاڑ کر اپنا دھندا جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ کرمانی چاہتا تو اُسے اُس کے گینگ سمیت باآسانی گرفتار کر سکتا تھا۔ گینگ سمیت اُس کا ان کاؤنٹر کر سکتا تھا۔ شہر میں غنڈا گردی کے ساتھ ساتھ پولیس گردی بھی عروج پر تھی۔ عامی اُستاد تو اُس وقت ایک عام سا غنڈا تھا سو کوشش کے باوجود کرمانی کو انکار نہ کر سکا۔

" ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔" وہ نیم رضامندی سے بولا" کہ پاشا صاحب کے دشمن کو.............."

" کوشش نہیں۔" کرمانی نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلامی کی۔" بلکہ کام کر کے دکھانا ہے، مجھے لفظ کوشش سے نفرت ہے کیونکہ یہ لفظ اکثر جھوٹے لوگ استعمال کرتے ہیں۔"

" اوکے ہو جائے گا۔" اُس نے پہلی بار پُر عزم لہجے میں جواب دیا اور نوٹوں کی گڈیاں اور تصویر اُٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔

" ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔" کرمانی نے مطمئن انداز میں کہا۔" میں بعد میں تم سے فون پر رابطہ کر لوں گا۔"

اُس نے دونوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

" کرمانی! یہ تم نے کیا کیا؟" عامی اُستاد کے نکلتے ہی پاشا نے سوال کیا۔" میں نے تو اس کام کے بدلے میں بیس لاکھ روپے دیے ہیں۔"

" اُس کی جتنی اوقات تھی میں نے دے دیے۔" کرمانی نے قہقہہ لگایا۔" بقیہ دس لاکھ روپیا میں نے بطور نذرانہ رکھ لیا ہے۔"

پاشا نے ہنس کر کہا۔" تمہارا نذرانہ تو میں نے ویسے بھی دینا ہی تھا۔ پھر اس جلد بازی کی کیا ضرورت تھی؟"

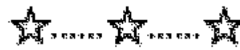
" بہت اشد ضرورت تھی پاشا صاحب! دراصل بی سائٹ پہ میں نے دو کمروں کا ایک بہت ہی عمدہ فلیٹ دیکھ رکھا ہے اور مالک پہلے فرصت میں ہی اُسے ٹھکانے لگانے کی سوچ رہا ہے۔ فکر نہ کریں آپ کے نذرانے کی بھی ضرورت پڑے گی۔ بی سائٹ پہ آج کل بہت ہائی ریٹ چل رہا ہے۔" کرمانی نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے

تفصیلی جواب دیا۔

''ڈونٹ وری وہ فلیٹ سمجھو آپ کا ہوگیا۔'' پاشا نے اُٹھتے ہوئے اجازت طلب انداز میں کہا تو کرمانی بھی اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''اوکے تو اب اجازت دیجیے۔'' پاشا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

کرمانی نے اُس کا ہاتھ تھام کر خدا حافظ کہا اور پاشا لبوں پہ مسکراہٹ سجائے رخصت ہوگیا۔



زارا احمد سے اُس کی دوستی بذریعہ انٹرنیٹ ہوئی تھی۔ دو ماہ قبل جب اُس نے فیس بک پر اپنی آئی ڈی بنائی تو اُسے پہلی فرینڈ ریکوئسٹ زارا احمد ہی کی موصول ہوئی تھی۔ جسے اُس نے بلا سوچے سمجھے ہی کنفرم کردیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فیس بک کی یہ دوستی بالمشافہ ملاقاتوں میں بدل گئی۔ زارا احمد اُس کے تصور سے کہیں بڑھ کر حسین وجمیل نکلی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں نہایت ہی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ دوستی محبت میں بدلی تو ملاقاتوں کا دورانیہ بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ اکثر ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ کبھی کسی پارک میں تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں۔ گزشتہ ایک ماہ سے اُن کی یہ ملاقاتیں جاری تھیں۔ کبھی دو دن بعد تو کبھی تین دن بعد اُن کی ملاقات ضروری تھی۔

زارا نے اپنے متعلق اُسے جو کچھ بتایا تھا اُس کے مطابق اُس کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا اور اُس کے والد ایک سرکاری سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب کہ اُن کا خاندان پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ماں باپ، ایک بھائی اور دو بہنیں، بہن زارا سے بڑی تھی جب کہ بھائی اُس سے چھوٹا تھا اور وہ کالج میں تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ عماد نے بھی اپنے متعلق اُسے سب کچھ سچ سچ بتادیا تھا کہ سوائے ایک باپ کے اُس کا بھری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ عماد نے اب تک یہ بات باپ سے چھپا رکھی تھی تاہم وہ زارا سے شادی کرنے کے لیے پوری طرح سنجیدہ تھا اور باپ سے بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔

اُس دن بھی وہ زارا کے ساتھ سی سائٹ پر گھوم رہا تھا جب اچانک اُسے یہ احساس ہوا کہ کوئی اُن دونوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اُس نے زارا سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ بے پروا سے انداز میں بولی۔ ''عمو

یار اتمہارا بھی جواب نہیں ہے۔ یہاں کتنے ہی لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا پتا کہ وہ کون ہے؟"

وہ بولا۔ "میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہمیں نقصان پہنچانے والا ہے۔"

"لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ محض تمہارا وہم ہے۔" زارا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تم میرے خدشے کو مذاق میں مت ٹالو۔" وہ پُر زور انداز میں بولا۔ "مجھے اس سے قبل کبھی اس طرح کا وہم نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" زارا نے سر جھٹکا۔ "ہمیں اپنی تفریح برباد نہیں کرنا چاہیے۔"

زارا کے تسلی دینے پر وہ وقتی طور پر مطمئن ہو کر چپ ہو گیا۔ تب زارا نے موضوع بدل کر پوچھا۔ "تمہارے انٹرویو کا کیا بنا، کوئی اُمید ہے کہ نہیں؟"

"اُمید تو تب ہوگی جب میرے پاس کسی تگڑی شخصیت کی سفارش یا نذرانے کی صورت میں کرنسی نوٹوں کا بنڈل ہوگا۔ آج کل ذہانت اور ٹیلنٹ کو کون دیکھتا ہے؟ اس ملک میں صرف سکہ رائج الوقت اور سفارش چلتی ہے۔" اُس نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ "مجھے تو جاب وغیرہ میں بالکل انٹرسٹ نہیں ہے۔ تم کوئی کاروبار کیوں نہیں کرتے........ جاب میں کیا رکھا ہے؟"

"کاروبار کے لیے بھی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارا گھر ابو کی تنخواہ سے چلتا ہے۔ یہ تو ہمارا کنبہ محدود ہے ورنہ ابو کی تنخواہ تو اس قدر قلیل ہے کہ چند افراد کا پیٹ مشکل سے پلتا۔"

"اگر میں سرمایے کا بندوبست کر دوں تو کیا تم کاروبار کرو گے؟" زارا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اُس نے چونک کر زارا کی طرف دیکھا اور پھر ہنس کر کہا۔ "تمہاری اتنی اوقات کہاں...... کیوں مجھ سے تمسخر کرتی ہو؟"

وہ بولی۔ "اوقات ہے یا نہیں اس بات کو چھوڑو تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ، کتنے سرمایے سے کام چل جائے گا؟"

"او میڈم!" اُس نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے کریانے کی دکان تو نہیں کھولنی، کاروبار کرنے کے لیے اور وہ بھی

کراچی جیسے شہر میں جانتی ہو کتنے سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے؟ کروڑوں روپے کی۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ تمہارے پاس تو ڈھنگ کا لباس بھی نہیں ہے، کروڑوں روپیا کہاں سے لاؤ گی؟''

''وہ میرا مسئلہ ہے تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ؟'' وہ بدستور سنجیدہ تھی۔

''بس مذاق بہت ہوگیا، چلو کہیں سے کولڈ ڈرنک پیتے ہیں۔ سرمایا دینے کی بجائے بل چکا دینا۔''

''تم میری توہین کر رہے ہو۔'' اس نے پہلی بار غصے کا اظہار کیا۔''میں چاہوں تو ایک بزنس ایمپائر کھڑی کر سکتی ہوں۔''

''شاید یہ کسی نئی فلم کے ڈائیلاگ ہیں؟'' عماد نے ایک اور قہقہہ لگایا۔''بس اب خوابوں کی دنیا سے باہر آجاؤ میڈم........ بہت ہوگیا۔''

اسی دوران وہ ایک سنسان مقام کے نزدیک پہنچ گئے۔ قریب ہی ناریل کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ معا اُس جھنڈ سے چار آدمی نکلے اور تیزی سے اُن کی طرف بڑھے۔ وہ دونوں آپس میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنھیں خبر ہی نہ ہو سکی کہ وہ خطرہ جو تھوڑی دیر قبل عماد نے محسوس کیا تھا اُن کے سر پر پہنچ چکا ہے۔ وہ چار تھے اور چاروں بٹے کٹے تھے۔ دو نے عماد کو چھاپ لیا جب کہ بقیہ دو نے زبردستی زارا کو اُٹھالیا اور برق رفتاری سے دوبارہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئے۔ اُنھوں نے زارا کو چلانے کا موقع تک نہیں دیا تھا۔ دوسری طرف وہ دو جو عماد کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے پہلے تو عماد کی خوب دھلائی کی اور پھر تقریباً اُسے گھسیٹتے ہوئے جھنڈ کے اندر لے گئے۔ عماد کی بُری حالت تھی اُس کی ناک اور باچھوں سے خون رس رہا تھا جب کہ شرٹ کا گریبان گلے میں جھول رہا تھا۔ جھنڈ میں تقریباً تین سو فٹ کے فاصلے پر ایک ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ جو شاید حملہ آوروں ہی کی تھی۔ پٹنے کے دوران عماد بار بار اُن سے اپنی غلطی پوچھتا رہا تھا مگر اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

جھنڈ میں لے جا کر اُنھوں نے عماد کو مزید چند ٹھوکریں رسید کر دیں اور پھر اُن میں سے ایک بولا۔''آئندہ اگر تم زارا میم صاحب کے قریب بھی پھٹکے تو کاٹ کر پھینک دیں گے۔''

''وہ........ مم........ میں......'' اُس نے کراہتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ایک اور زوردار ٹھوکر اُس کے پہلو میں پڑی۔ درد کی شدت سے اُس نے چلانا شروع کر دیا۔ تب ٹھوکر مارنے والا دھمکی آمیز انداز میں بولا۔''

چلانا بند کر دو ورنہ ہمیشہ کے لیے زبان بند کر دوں گا۔"

وہ فوراً چپ ہوگیا۔ یوں جیسے کھلونے کی چابی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بدحال سا ریتلی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ گو کہ وہ جسمانی لحاظ سے اُن میں سے کسی سے بھی کم نہیں تھا۔ مگر وہ دونوں مسلح تھے۔ اُس کی مدافعت پر اُسے شوٹ بھی کر سکتے تھے۔ وہ جوانی کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو چپ چاپ پڑا رہا۔ پورے بدن میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُنھوں نے بہت ہی بے دردی کے ساتھ اُسے مارا تھا۔ وہ دونوں چند لمحے اُس کی حالت سے محظوظ ہوتے رہے۔ پھر ایک نے جیب سے والٹ نکال کر چند بڑے نوٹ نکالے اور اُس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا۔ "ان پیسوں سے اپنا علاج کرا لینا اور خبردار آج کے بعد زارا بی بی سے ملنے کی کوشش مت کرنا ورنہ اگلی بار جان سے جاؤ گے۔" وہ دھمکی دے کر وین کی طرف بڑھ گئے جب کہ عماد وہیں پڑا رہ گیا۔

جب کافی دیر گزر گئی تو وہ کراہتے ہوئے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ایک طرف چل دیا، زمین پر پڑے ہوئے نوٹوں کی طرف اُس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اُس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا مگر وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا لیکن پھر اچانک ہی اُس کی ہمت جواب دے گئی۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر تن گئی اور وہ لڑکھڑاتا ساحل کی ریت پر گر گیا۔



سلیمان پاشا نے گھور کر اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا اور پھر درشت لہجے میں بولا۔ "میرے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی...... کم از کم باپ کے مرتبے کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ سلیمان پاشا کی بیٹی ایک تھرڈ کلاس نوجوان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔"

"سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں ڈیڈ۔" وہ بلا جھجک بولی۔ "یہ اپر مڈل اور لوئر کلاس تو آپ جیسے لوگوں نے بنائی ہے۔ خدا نے تو تمام انسانوں کو ایک جیسا ہی بنایا ہے۔ سبھی کے دو ہاتھ، دو پاؤں اور دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ میں نے آج تک کسی اپر کلاس والے کے پاس کوئی اضافی عضو نہیں دیکھا۔"

"اپنی یہ گھٹیا فلاسفی اپنے پاس رکھو۔" پاشا نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ "تم زارا سلیمان احمد پاشا ہو، پہلے اُس کی اور اپنی اوقات دیکھو پھر......"

"میں اُس سے کسی پاشا کی بیٹی بن کر نہیں ملتی ڈیڈ۔" زارا نے قطع کلامی کی۔" وہ میری حیثیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"وہاٹ نانسنس .... کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں وہ مجھے ایک سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سمجھتا ہے۔ میں نے اُسے یہی بتایا ہے۔"

"تم نے اُسے حقیقت کیوں نہیں بتائی؟ پاشا نے پوچھا۔

"بس ایسے ہی اُسے آزمانے کے لیے۔"

"کیوں ...... اور کس لیے؟" وہ دوبارہ بپھر گیا۔" کون لگتا ہے وہ تمہارا؟ .... کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اُس دو ٹکے کے آدمی کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دینے کے لیے راضی ہو جاؤں گا؟"

"مجھے اپنا جیون ساتھی منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ آپ رکاوٹ بنیں گے تو میں ...."

"بکواس بند کرو۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے چلایا۔" تم نے اگر اُس حرام زادے سے ملنا نہ چھوڑا تو میں اُسے مٹی میں ملا دوں گا۔"

ایسے ہی وقت بیگم پاشا کمرے میں داخل ہو کر بولی۔" جوان بیٹی پر اس طرح چلاؤ گے تو وہ بغاوت پر اُتر آئے گی۔ یہی بات آپ اسے پیار سے بھی سمجھا سکتے ہیں۔"

"یہ سب تمہارے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔" وہ بیگم پر چڑھ دوڑا۔" کہ آج یہ مجھے یعنی اپنے باپ کو آنکھیں دکھانے لگی ہے۔ بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ مجھ سے نظریں جھکا کر بات کرتے ہیں جب کہ یہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ اِسے سمجھاؤ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

بیگم نے منہ بنا کر کہا۔" اپنی غلطیاں مجھ پر کیوں تھوپتے ہو؟ سر پر تو اسے آپ نے چڑھا رکھا ہے۔ میں تو اپنے بھائی کے بیٹے افضال سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی، آپ ہی نہیں مان رہے تھے۔ اب بھگتو۔"

"دفع کرو افضال کو۔" پاشا نے چڑ کر کہا۔" ایک نمبر کا آوارہ اور حرام خور ہے۔ اُسے تو میں اپنے جوتے بھی صاف کرنے کے لیے نہ دوں، تم بیٹی دینے کی بات کرتی ہو؟"

بیگم نے ہاتھ نچایا۔" میرا بھتیجا آوارہ ہے تو اب اس نے کون سا شہزادہ چُن لیا ہے؟"

''افضال کی طرح میٹرک فیل نہیں ہے وہ، ایم ایس سی کیا ہے اُس نے۔ بہت جلد اُسے کوئی اچھی جاب مل جائے گی۔'' زارا نے عماد کا دفاع کرتے ہوئے جواب دیا۔

پاشا بولا۔'' تم ماں بیٹی فضول میں ایک دوسرے سے مت لڑو، زارا کی شادی جہاں میں چاہوں گا وہیں ہوگی۔''

''میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ جس کھونٹی سے چاہو گے باندھ دو گے۔'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

''تم نے دیکھا یہ کس قدر بدتمیز ہوگئی ہے۔'' وہ بیگم کی طرف متوجہ ہوگیا۔'' مجھے کچھ کرنا پڑے گا ورنہ یہ میری عزت کا جنازہ نکال دے گی۔''

بیگم بولی۔'' اُسے پیار سے سمجھاؤ، سختی کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں بغاوت دیکھی ہے۔''

''میں یہ نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟''

وہ بولی۔'' افضال میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ بھائی صاحب کو ہاں کر دیں۔ اس طرح سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے محفوظ رہے گی۔ اپنا اپنا ہوتا ہے جب کہ............''

''بس......'' پاشا نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلامی کی۔'' میں اس وقت افضال کی تعریف سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے سوچنے دو کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا؟''

''تم سوچتے رہو گے اور بیٹی ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

''میں جو سوچتا ہوں وہ کرتا بھی ہوں........ جاؤ میرے لیے کافی بھجوا دو۔'' پاشا نے حکمیہ انداز میں کہا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

عماد کو ایک ہمدرد نوجوان نے ہاسپٹل پہنچا دیا تھا۔ چونکہ اُسے کوئی اندرونی چوٹ نہیں آئی تھی، سو ڈاکٹر نے اُس کی مرہم پٹی وغیرہ کرنے کے بعد اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اُس روز سنڈے کی چھٹی تھی۔ اس لیے عماد جب مرہم پٹی کروا کر گھر پہنچا تو ظہیر احمد اُس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کس سے جھگڑا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ کون تھا وہ؟ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔"
اکلوتے بیٹے کو زخمی حالت میں دیکھ کر اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔
"میں ٹھیک ہوں۔ معمولی سی چوٹیں ہیں یہ، آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔" عماد نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ "میں تمہارا باپ ہوں مجھ سے بات چھپاؤ گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا، وہ بس ایک غنڈ............" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"عماد! تم کچھ چھپا رہے ہو........ مجھے بتاؤ کس سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

"ابو! آپ رہنے دیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں کیسے یقین کر لوں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ تم میرے بڑھاپے کا واحد سہارا ہو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ شہر کے حالات تو دیکھو روزانہ بیسیوں لاشیں گر جاتی ہیں مگر قاتلوں کا کوئی پتا نہیں چلتا۔" اُس نے دل میں پنہاں خدشے کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ "میرے زخمی ہونے کا شہر کے حالات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔"

"جب تک تم مجھے سچ نہیں بتاؤ گے میری پریشانی کم نہیں ہو گی۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُس نے پورا واقعہ باپ کے سامنے بیان کر دیا۔ ساری بات غور سے سننے کے بعد وہ بیٹے سے بولا۔ "یہ لڑکی ذرا را تم سے جھوٹ بول رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ تم اُس سے مت ملنا ورنہ اگلی بار جان سے جاؤ گے۔"

"مگر ابو! میں اُس سے پیار کرتا ہوں اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس سے ملنا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟" اُس نے احتجاج کیا۔

"زندگی ایک بار ملتی ہے بیٹے! اس کی قدر کرو، کیا پتا وہ بڑے باپ کی بیٹی تجھے اُلو بنا رہی ہو؟ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اُس سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے؟"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں ابو، میں اُس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

"اور میں......میرا کیا ہوگا......یہ کبھی سوچا ہے تم نے؟" وہ ایک دم جذباتی ہوگیا۔ "اگر تمھیں کچھ ہوگیا تو میرا کیا بنے گا؟ کیسے جیوں گا میں......بولو......جواب دو......اب چُپ کیوں ہو؟"

عماد نے سر جھکا لیا۔ تب باپ نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھ اور باز آجا......میں تمہاری جدائی سہہ نہیں پاؤں گا......سمجھنے کی کوشش کر بیٹے! بعض خواہشیں انسان کی جان لے لیتی ہیں مگر پھر بھی تشنہ کام رہتی ہیں۔ ایسے خواب دیکھنے کا کیا فائدہ جن کی تعبیر انگارے ہوں؟"

"ٹھیک ہے ابو جی۔" وہ غیر متوقع طور پر رضامند ہوگیا۔ "آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ میں زارا سے نہیں ملوں گا۔"

"جیتے رہو بیٹا۔" اُس نے خوش ہوکر دعا دی۔ "تم نے میرا مان رکھ لیا ہے۔"

عماد کے وعدہ کرنے سے اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا اور وہ واقعی بے حد خوش نظر آرہا تھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ وعدے تو ہوتے ہی توڑنے کے لیے ہیں۔ سو عماد بھی اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔

دوسرے دن جب وہ گھر میں اکیلا تھا تو اُسے زارا کا فون آگیا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کرتا رہا لیکن جب زارا بار بار کال کرنے لگی تو اُسے فون اٹینڈ کرنا ہی پڑا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے سخت ناراض ہو۔" رابطہ ہوتے ہی زارا نے ندامت سے کہا۔ "مگر یقین کرو میں نے تم سے جھوٹ کسی مصلحت کے تحت بولا تھا۔ میں تو اُسی روز تمھیں سچ بتانے والی ہی تھی کہ عین موقع پر ڈیڈی کے بھیجے ہوئے آدمی پہنچ گئے۔"

"آدمی یا غنڈے؟" اُس نے جل کر پوچھا۔

وہ بولی۔ "تم یہ کہنے میں حق بجانب ہو لیکن ڈیڈی ایک بزنس مین ہیں اور بزنس مین غنڈے نہیں پالتے۔"

"مگر انھوں نے مجھ سے سلوک تو غنڈوں والا کیا ہے۔" وہ بدستور ناراضی کے عالم میں بول رہا تھا۔ "بہت مارا ہے اُن حرامیوں نے مجھے۔"

"مجھے بھی ڈیڈی نے بہت زیادہ بے عزت کیا ہے اور تم سے ملنے پر پابندی عائد کردی ہے۔" اُس نے اپنا

دکھڑا بیان کیا۔

"تو نہ ملو.......کون کہتا ہے تم سے ملنے کو۔" اُس نے جل کر جواب دیا۔

وہ بولی۔" میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں تم سے نہیں ملوں گی۔ ڈیڈی مجھ پر پہرا تو نہیں بٹھا سکتے، میں تم سے ملوں گی اور ضرور ملوں گی۔"

"مگر میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" اُس نے طنزاً پوچھا۔" ذرا سی مار کھا کر کیا عشق کا بھوت اُتر گیا ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہارے باپ کے غنڈوں سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے باپ سے کیا ہوا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا۔"

"کیسا وعدہ؟" اُس نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"میرے باپ نے مجھے قسم دی ہے کہ میں آئندہ تم سے نہ ملوں۔"

"تو کیا اب تم مجھ سے نہیں ملو گے؟"

میں باپ سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑ سکتا زارا! ہمیں ایک دوسرے کو بھلانا ہوگا۔"

وہ بولی۔" میں مر تو سکتی ہوں مگر تجھے نہیں بھول سکتی۔ یاد رکھنا اگر تم مجھے ملنے کے لیے نہ آئے تو میں زہر کھالوں گی۔ کل دن کے تین بجے میں اُسی پارک میں تمہارا انتظار کروں گی جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔ ٹھیک تین بجے پہنچ جانا دیر ہوئی تو تمہیں وہاں میری لاش ملے گی۔"

"یہ.......یہ کیا بکواس کر رہی ہو زارا!" وہ بوکھلا گیا۔" بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں مجبور ہوں تم سے......."

"مجھے کچھ نہیں سننا.......سمجھے تم۔" اتنا کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

عامی اُستاد کے لیے پہلا قتل ہی مشکل تھا۔ اس کے بعد تو اس نے پیچھے مڑ کر ہی نہ دیکھا بس قتل پہ قتل کرتا چلا گیا۔ اُس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ سلیمان پاشا آخر کیوں ایک خاص مکاتب فکر کے لوگوں کو ہی

قتل کرواتا ہے؟ حالانکہ یہ سوال غور طلب تھا۔ پاشا لسانی اور مسلکی تعاصب کو ہوا دے رہا تھا۔ ویسے بھی اُن دنوں شہر کے حالات لسانی اور مسلکی لحاظ سے نہایت ہی ابتر تھے۔ لوگ مساجد میں جاتے ہوئے بھی سو بار سوچتے تھے۔ عامی کا اپنا کوئی مسلک نہیں تھا۔ اُسے بس کرنسی نوٹوں سے پیار تھا اور پاشا نے اُسے دیتے ہوئے کبھی بھی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ عامی اب پاشا کے لیے ایک روبوٹ کے مانند تھا۔ پاشا جو حکم دیتا عامی بلا چوں چراں اُس پر عمل کرتا۔ عامی کو انسپکٹر کرمانی کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ وہ بیسیوں قتل کرنے کے بعد بھی آزادی سے گھوم رہا تھا۔

عامی کا یہ ٹارگٹ کلنگ والا کام جاری تھا کہ ملک میں نئے جمہوری دور کا آغاز ہوگیا۔ گذشتہ حکومت نے چونکہ شہر میں جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا تھا اس لیے نئے حکم رانوں نے اقتدار سنبھالنے کے چند ماہ بعد میں شہر میں آپریشن کرنے کے احکامات صادر کردیے تھے۔ جونہی آپریشن شروع ہوا شہر میں سکیورٹی فورسز اور جرائم پیشہ گروہوں کے درمیان آئے دن فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ کچھ علاقوں میں گینگ وار بھی شروع ہوگئی، جو دن میں کئی کئی گھنٹے جاری رہتی تھی۔ اُنہی دنوں عامی کو انسپکٹر کرمانی کی کال موصول ہوئی۔ ”عامی!“ کرمانی نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ ”تم کچھ ماہ کے لیے انڈر گراؤنڈ چلے جاؤ یا پھر اپنے گاؤں بھاگ جاؤ، کیونکہ حالات بہت زیادہ خراب ہونے والے ہیں۔“

”نہیں میں نہیں بھاگوں گا۔“ اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کرمانی کو انکار کیا۔ ”میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ کرمانی کو غصہ آگیا۔ ”آپریشن پولیس کی بجائے ایف سی فورس کر رہی ہے“

”ایف سی فورس کرے یا آرمی کرے میں نہیں بھاگوں گا۔“

”مطلب تم کتے کی موت مرنے کا ارادہ کر چکے ہو؟“ کرمانی نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

وہ سارا احترام بالائے طاق رکھتے ہوئے بولا۔ ”کرمانی! کتے کی موت میں اکیلا نہیں مروں گا، میرے ساتھ تم اور پاشا صاحب بھی ایسی ہی موت مرو گے۔“

”اوہ.......تو اب چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔“ کرمانی کا انداز مذاق اُڑانے والا تھا۔ ”تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ تم کس کو دھمکی دے رہے ہو؟“

''ہاہاہا.......'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''کرمانی! میں کوئی معمولی چور اچکا نہیں ہوں کہ تمہاری دھونس میں آ جاؤں گا۔ سنو! میرا اگر بال بھی بیکا ہوا تو تم اور پاشا زندہ نہیں بچو گے۔ تم دونوں کے خلاف میرے پاس ایسے ایسے ثبوت موجود ہیں کہ دونوں عمر بھر جیل میں چکی پیستے رہو گے۔''

عامی کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور کرمانی کا غصہ جھاگ کے مانند بیٹھ گیا۔ ''یار! میں تو تمہیں آزما رہا تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم تو خواہ مخواہ سیریس ہو گئے ہو۔''

''بس اسی طرح میں بھی تمہیں آزما رہا تھا۔ چلو حساب برابر ہو گیا۔'' اُس نے جواب دیا۔

'' مگر ثبوتوں کی بات کر کے تم نے مجھے ڈرا دیا ہے........کیا سچ تم نے میرے اور پاشا کے خلاف.........''

''ڈونٹ وری کرمانی۔'' اُس نے قطع کلامی کی۔ ''ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ ہی مریں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کو دھوکا دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہمارا اتحاد ہی ہمیں بچا سکتا ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' کرمانی اُس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''بہرکیف تم محتاط رہنا سکیورٹی فورسز کا کوئی پتا نہیں ہے کسی وقت بھی دھاوا بول سکتی ہیں۔''

''اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں فی الفور تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم کوئی بھی الزام لگا کر مجھے گرفتار کر لینا۔''

''گڈ یہ پلان ٹھیک رہے گا۔'' کرمانی نے خوشی کا اظہار کیا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

دوسرے روز شام ڈھلنے کے بعد سکیورٹی فورس کے ایک دستے نے اُن کے فلیٹ پر دھاوا بول دیا۔ عامی نے اپنے گینگ کے ساتھ مل کر چند لمحے تو سکیورٹی فورس کا مقابلہ کیا مگر پھر موقع ملتے ہی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔ اُس کے فرار ہونے کے فوراً بعد ہی اُس کے تمام ساتھی سکیورٹی فورس کے ہاتھوں مارے گئے۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

☆......☆......☆

سہ پہر کے وقت انسپکٹر کرمانی آفس کی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اچانک اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے سستی کے عالم میں ٹیبل سے سیل فون اُٹھایا اسکرین پر ایک خمار آلود نگاہ ڈالی تو اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی نیند اُڑ گئی۔ سیل فون کی اسکرین پر پاشا کا نام جھلملا رہا تھا۔ اُس نے فوراً کال ریسیو کی۔ ''ہیلو سر! انسپکٹر کرمانی بات کر رہا ہوں۔ خیریت تو ہے جناب! اس وقت کیوں زحمت کی؟''

دوسری جانب سے پاشا بولا۔ ''خیریت ہوتی تو تجھے فون کیوں کرتا؟''

''حکم کریں جناب۔'' کرمانی نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔

پاشا نے شہر کے ایک مشہور و معروف پارک کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''تم چند کانسٹیبل لے کر فوراً وہاں پہنچ جاؤ، میرا ایک آدمی وہاں موجود ہے جو تمہیں بتائے گا کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ اور ہاں اُس کی کسی بات سے انکار مت کرنا۔''

''مگر جناب! کچھ پتا تو چلے کہ میں نے کرنا کیا ہے؟''

پاشا بولا۔ ''ایک نوجوان کو گرفتار کرنا ہے، مگر خیال رکھنا وہ عامی اُستاد کا ہم شکل ہے کہیں دھوکا نہ کھا بیٹھنا۔ دونوں کی شکل و صورت میں معمولی سا فرق بھی نہیں ہے۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوگی، جسے تم نے ہاتھ بھی نہیں لگانا........... سمجھ گئے؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا لیکن وہ لڑکی کون...............''

''وہ لڑکی میری بیٹی ہے۔'' اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پاشا بول پڑا۔ ''وہ ضرور ہنگامہ کرے گی مگر تم لوگوں نے اُس کی بات سُنی ہے اور نہ ہی اُسے کچھ کہنا ہے۔ یاد رکھنا اگر میری بیٹی کو خراش بھی آئی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔''

''پاشا صاحب! بے فکر رہیں بے بی کی طرف کوئی دیکھے گا بھی نہیں۔ آپ کی بیٹی تو کرمانی کی بھی بیٹی۔''

''گڈ۔'' پاشا نے خوش ہو کر کہا۔ ''مجھے تم سے یہی اُمید تھی اور ہاں اُس نوجوان کا نام عماد ہے اور اُس کا باپ ظہیر احمد صدیقی ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک ہے۔''

''میں ابھی نکلتا ہوں جناب! ایک گھنٹے کے اندر آپ کو خوش خبری مل جائے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ سرعت سے

اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پاشا نے کہا۔ "او کے خدا حافظ۔" اور پھر کال ڈس کنکٹ کر دی۔

دس منٹ کے بعد انسپکٹر کرمانی کی جیپ پولیس اسٹیشن سے نکلی اور مطلوبہ مقام کی طرف روانہ ہو گئی۔ جیپ میں چار ہٹے کٹے کانسٹیبل بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں شکل سے ہی خون خوار نظر آ رہے تھے۔ وہ پولیس میں کم اور غنڈے زیادہ لگتے تھے البتہ یونی فارم نے اُن کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ ٹھیک نصف گھنٹے کے بعد جیپ شہر کے ایک مشہور و معروف پارک کے مین گیٹ سے گزرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پارک میں بہت سے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کچھ جوڑے سنگی بنچوں پر بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ انسپکٹر کرمانی نے پارک کے عین وسط میں جیپ روک دی۔ جیپ کے رکتے ہی چاروں کانسٹیبل تیزی سے نیچے اُترے اور رائفلوں کو فائرنگ پوزیشن میں پکڑتے ہوئے انسپکٹر کرمانی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ کرمانی ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ جیپ سے نیچے اُترا اور عقابی نگاہوں سے پارک کا جائزہ لینے لگا۔ اُسے اُس بندے کی تلاش تھی جس کے بارے میں پاشا نے بتایا تھا۔

"سر جی! حکم کریں؟" ایک تیز طرار کانسٹیبل نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

"صبر کرو صبر.........اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔" کرمانی نے جواب دیا اور پھر ایک نوجوان کی طرف متوجہ ہو گیا، جو تیزی سے اُن کی طرف آ رہا تھا۔

"سر جی! میں آپ ہی کا منتظر تھا۔" نوجوان نے قریب پہنچتے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا شکار وہ سامنے والے بنچ پر بیٹھا ہے۔"

"ہوں۔" کرمانی نے اُس سے ہاتھ ملانے کے بعد ذومعنی انداز میں سر ہلایا۔ "تو یہ ہے وہ حرام زادہ جو پاشا صاحب کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے؟"

"یہی ہے جناب۔" نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس کے ساتھ جو لڑکی بیٹھی ہوئی ہے وہ پاشا صاحب کی اکلوتی بیٹی زارا بی بی ہے۔"

"تم کسی طرح زارا بی بی کو یہاں سے ہٹا سکتے ہو؟" کرمانی نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"بہت مشکل ہے جناب وہ مجھے نہیں پہچانتی...... میری بات بھی نہیں مانے گی۔"

"ہوں۔" کرمانی نے سرہلایا۔"اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی کچھ سوچنا پڑے گا ورنہ یہ تو شور مچائے گی۔ اپنے عاشق کو آسانی سے گرفتار نہیں ہونے دے گی۔"

"جناب! پاشا صاحب نے حکم دیا ہے کہ زارا بی بی کو ہاتھ بھی نہیں لگانا۔ اگر............"

"مجھے پتا ہے۔" کرمانی نے اُس کی بات کاٹی۔"چلواب تم بھاگ جاؤ۔"

نوجوان سلام کرتے ہوئے اُلٹے قدموں واپس ہوگیا۔

نوجوان کے جانے کے بعد کرمانی نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر سپاہیوں سے مخاطب ہوکر بولا۔ "اسے پُرامن طریقے سے گرفتار کرنے کا پلان میں نے سوچ لیا ہے۔تم میں سے کسی نے بھی کوئی مداخلت نہیں کرنی، بس میری تائید کرنی ہے۔اب چلو۔"

وہ سب کرمانی کی پیروی کرتے ہوئے اُس بنچ تک پہنچ گئے، جہاں عماد اور زارا بیٹھے مستقبل کے منصوبے ترتیب دے رہے تھے۔ پولیس کو اپنے سرپر دیکھ کر وہ دونوں ایک دم گھبرا گئے۔خاص کر عماد کے چہرے پر تو ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دوسری طرف اُسے دیکھ کر کرمانی کو بھی حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔عماد نامی وہ نوجوان بالکل عامی اُستاد کا ہم شکل تھا۔دونوں کی شکل میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں تھا۔ اگر پاشا اُسے اس بات سے آگاہ نہ کر چکا ہوتا تو یقیناً وہ عماد کو عامی اُستاد ہی سمجھتا۔

"عماد! تمہارا ہی نام ہے ناں؟" کرمانی نے خلاف توقع ملائم لہجے میں سوال کیا۔

"ج.........جی........جناب........میرا ہی نام ہے۔" عماد نے گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

"اور باپ کا نام ظہیر احمد صدیقی ہے؟" کرمانی نے دوسرا سوال کیا۔

"جی........ہاں۔" اُس نے اثبات میں سرہلایا۔"مگر........آپ یہ سب........کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"عماد! تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے پاس کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔دراصل تمہارے باپ کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور اس وقت وہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہاسپٹل میں پڑے ہوئے ہیں۔"

یہ دردناک خبر سن کر عماد کا رنگ یک دم فق ہوگیا۔ زارا بھی گھبرا گئی تھی۔ تاہم عماد نے انتہائی کرب کے عالم میں پوچھا۔ "انسپکٹر صاحب! ابو کی حالت کیسی ہے؟"

"یہ بات تو تجھے ڈاکٹر ہی بتا سکتے ہیں۔ اب چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" کرمانی نے عجلت میں جواب دیا۔

عماد خاموشی سے اُن کے ساتھ چل دیا۔ اس دردناک خبر نے اُسے اتنا بھی سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ پولیس والوں سے یہ پوچھتا کہ انھیں عماد کی یہاں موجودگی کا پتا کس طرح اور کیسے چلا؟ بڑی آسانی سے وہ کرمانی کے جال میں پھنس گیا تھا۔

وہ جیپ تک پہنچے ہی تھے کہ زارا بھی بھاگ کر وہاں پہنچ گئی اور بولی۔ "میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"سوری۔" کرمانی نے تاسف کے انداز میں سر ہلایا۔ "ہم تمھیں ایک پولیس وین میں نہیں لے جا سکتے۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔"

"زارا! تم جاؤ اللہ بہتر کرے گا۔" عماد اُس سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "میں تجھے کال کر کے سب کچھ بتا دوں گا۔" زارا کو وہاں چھوڑ کر عماد انسپکٹر کرمانی کے ساتھ چل دیا۔



کرمانی ورغلا کر عماد کو سیدھا تھانے لے آیا۔ اُسے جیپ سے اُتارا اور سپاہیوں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔ "اسے اچھی طرح سبق سکھا کر حوالات میں بند کر دو۔"

"م........ مگر........ جناب! میرا قصور کیا ہے؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے سلیمان پاشا جیسے بڑے آدمی سے دشمنی مول لی ہے۔" کرمانی نے جواب دیا اور پھر سپاہیوں کو اشارہ کرتے ہوئے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

چاروں سپاہی آگے بڑھے اور بھوکوں گدھوں کی طرح عماد پر ٹوٹ پڑے۔ وہ چیختا رہا، چلاتا رہا، اُن کی منتیں کرتا رہا اور حتی المقدور خود کو بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن حکم کے وہ غلام سنی ان سنی کرتے ہوئے اُس کی پٹائی میں لگے رہے۔ وہ انسان تھا کوئی پتھر تو تھا نہیں آخر کار مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گیا۔ تب سپاہیوں نے اُسے

اُٹھا کر حوالات میں پھینک دیا۔اس دوران آفس کے اندر انسپکٹر کرمانی فون پر پاشا کو اپنی کامیابی کی خبر سنا رہا تھا۔"پاشا صاحب!" وہ خوشامدی انداز میں بولا۔"ہم نے اُس کی خوب مرمت کی ہے اور اب حوالات میں پڑا ہے.......حکم کریں جناب! اُس کا کیا کرنا ہے؟"

پاشا بولا۔"کرمانی! اُسے ایک بار میرے آدمی سمجھا چکے ہیں لیکن وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو اپنا بُرا بھلا سمجھتے ہیں۔ایسے لوگوں کا ایک ہی علاج ہوتا ہے کہ انھیں اللہ میاں کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

کرمانی نے کہا۔"پاشا صاحب! یہ کام تو آپ عامی اُستاد سے بھی کرا سکتے تھے۔پھر مجھے............"

"شہر کے حالات دیکھ رہے ہو کرمانی۔" اُس نے قطع کلامی کی۔"تمام جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف آپریشن شروع ہو چکا ہے۔عامی جیسے غنڈے کسی بھی وقت ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔تمھیں عماد کے ساتھ ساتھ عامی سے بھی دائمی چھٹکارا حاصل کرنا پڑے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ کام ہے بہت مشکل، میں اُوپر والوں کو کیا جواب دوں گا؟" اُس نے مکارانہ انداز میں جواب دیا۔

"تمھارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے اس لیے بہانے مت بناؤ اور ہاں تمھارے اکاؤنٹ میں آج ہی ایک کروڑ روپیا ٹرانسفر ہو جائے گا۔" پاشا نے اُس کی چال سمجھتے ہوئے پتا پھینکا۔

"بہت بہت شکریہ پاشا صاحب! میں اس معاملے کو جلد ہی نمٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اوکے میں خوش خبری سننے کا منتظر ہوں۔" پاشا نے جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

کرمانی کی نگاہوں کے سامنے ایک کروڑ روپے کے کرنسی نوٹ ناچنے لگے۔چنانچہ اُس کا عیار دماغ تیزی سے پلان ترتیب دینے لگا مگر اُسے کوئی مناسب حل نہیں سوجھ رہا تھا۔اس دوران مغرب کی اذان ہونے لگی۔وہ آفس سے نکلا اور اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔نماز اُس نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔چنانچہ یونی فارم اُتار کر اس نے عام لباس پہنا اور آرام کرنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا۔اُس کا دماغ اب بھی عامی اُستاد اور عماد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے منصوبے سوچنے میں اُلجھا ہوا تھا۔عماد سے تو وہ باآسانی نمٹ سکتا مگر عامی اُستاد جرم کی دنیا کا

بندہ تھا وہ آسانی سے اُس کے ہاتھ لگنے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی دو دن قبل عامی اُستاد نے اُسے یہ دھمکی دی تھی کہ اُس کے پاس کرمانی کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ کرمانی نہیں جانتا تھا کہ وہ ثبوت عامی اُستاد نے کہاں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں؟ ان ثبوتوں کی موجودگی میں وہ عامی اُستاد پر کسی طرح بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ وہ انھیں سوچوں میں غرق تھا کہ معاً اُس کا سیل فون بج اُٹھا۔ اُس نے سیل فون اُٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر عامی کا نام جھلملا رہا تھا۔

''یس۔'' اُس نے کال ریسیو کی۔ ''بولو کیا بات ہے؟''

''کرمانی! میرے سب ساتھی اب تک سکیورٹی فورس کے ریڈ میں مارے جا چکے ہوں گے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ پلیز یار! مجھے بچالو۔'' اُسے عامی اُستاد کی پریشان کن آواز سنائی دی۔

''تم فوراً میرے پاس پہنچ جاؤ، کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔'' کرمانی نے ذومعنی انداز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں ابھی پہنچتا ہوں۔''

''تم نے وہاں اپنے فلیٹ پر کوئی ثبوت وغیرہ تو نہیں چھوڑے ناں؟'' کرمانی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''نہیں میں سب کچھ نکال لایا ہوں۔''

''گڈ...... یہ تم نے اچھا کیا۔ بس اب فوراً پہنچنے کی کرو۔''

''اوکے میں آدھے گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔'' اُس نے جواب دیا تو کرمانی نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''اب تم سے نمٹوں گا حرام زادے۔'' کرمانی نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور پھر اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

عامی اُستاد ایک کرسی پر مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ جب کہ کرمانی اور دو خون خوار قسم کے کانسٹیبل اُس کے اردگرد کھڑے ہوئے تھے۔ کرمانی کے ہاتھ میں سروس ریوالور بھی موجود تھا جس کا رخ عامی کی طرف تھا۔

''شاباش! اچھے بچوں کی طرح وہ ثبوت میرے حوالے کر دو ورنہ مارے جاؤ گے۔'' کرمانی نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ریوالور لہرایا۔

”کبھی نہیں۔“ اُس نے بمشکل سر ہلایا۔”جب تک وہ ثبوت میرے پاس ہیں تم مجھے نہیں مار سکتے، البتہ چاہو تو جیل میں ڈال سکتے ہو۔“

”مار دو اسے۔“ کرمانی نے چلا کر کانسٹیبلوں کو حکم دیا۔

کرمانی کا حکم سن کر دونوں کانسٹیبل عامی پر ٹوٹ پڑے۔ اُنھوں نے اُس کے چہرے پر گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ عامی کی ناک اور باچھوں سے لہو رسنے لگا مگر وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے دانت بھینچے بیٹھا رہا۔ جب کہ کرمانی اُس کی چیخیں سننے کا منتظر تھا۔ چنانچہ کانسٹیبلوں پر چلانے لگا۔

”تم حرام خور ہو تمہارے ہاتھوں میں جان ہی نہیں ہے ورنہ یہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہوتا........مار دو اسے اور مارو میں اس کی چیخیں سننا چاہتا ہوں۔“

عامی کے لبوں پر ایک خون آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔”کرمانی! تم میری چیخیں سننے کے لیے ترستے رہو گے۔ جتنا مار سکتے ہو مار لو مگر میں نہیں چیخوں گا۔“

”تمہارا تو باپ بھی چیخے گا۔“

یہ کہہ کر کرمانی خود اُس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کس کس کر اُس کے چہرے پر گھونسے مار رہا تھا اور ایسی ایسی نادر و نایاب گالیاں دے رہا تھا جو عامی نے ایک غنڈہ ہوتے ہوئے بھی اس سے قبل نہیں سنی تھیں۔

دس منٹ کے بعد کرمانی کسی کتے کے مانند ہانپ رہا تھا جب کہ عامی پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ پٹتے ہوئے اُس کے منہ سے چند سسکیاں ضرور برآمد ہوئی تھیں لیکن وہ چلایا نہیں تھا۔

”پانی لاؤ۔“ کرمانی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے چلایا۔

ایک کانسٹیبل بھاگ کر پانی سے بھرا ہوا جگ لے آیا۔ ٹیبل سے گلاس اُٹھا کر اُس نے گلاس میں پانی ڈالا اور کرمانی کو پیش کرتے ہوئے بولا۔”لیجیے جناب۔“

کرمانی نے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔”اور ڈالو۔“ اُس نے گلاس آگے بڑھایا۔ یکے بعد دیگرے تین گلاس حلق میں انڈیلنے کے بعد جب قدرے اُس کی حالت سنبھل گئی تو وہ کرسی سے اُٹھ کر ایک بار پھر عامی کے سامنے پہنچ گیا۔ عامی بدستور نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

"پانی ڈالو اس کے چہرے پر۔" وہ پلٹ کر کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔ "اسے ہوش میں لاؤ........فوراً"

کانسٹیبل نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عامی کے چہرے پر پانی کے چند چھینٹے مارے تو اُس نے کراہتے آنکھیں کھول دیں۔ کرمانی نے طنزیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا اور نخوت بھرے انداز میں بولا۔" انسپکٹر کرمانی سے دشمنی کرو گے تو جان سے جاؤ گے........ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ میری بات مان کر اپنی جان بچالو۔"

وہ بولا۔" کرمانی! میرے ساتھ ایک سودا کرلو فائدے میں رہو گے۔"

"کیسا سودا؟" کرمانی نے چونک کر پوچھا۔

"ان کے سامنے نہیں بتا سکتا۔" اُس نے کانسٹیبلوں کی طرف دیکھا۔" یہ سودا تیرے اور میرے بیچ ہوگا۔"

کرمانی نے ہاتھ کے اشارے سے کانسٹیبلوں کو باہر بھیج دیا۔

"ہاں اب بولو کیسا سودا؟" وہ عامی سے مخاطب ہوا۔

"میرے اکاؤنٹ میں پانچ کروڑ روپے کی رقم موجود ہے۔ میرے ایک سائن سے وہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوسکتی ہے اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو۔"

پانچ کروڑ روپے کا سن کر کرمانی کی آنکھیں چمک اُٹھیں، تاہم وہ کچھ سوچ کر بولا۔" میرے لیے رقم سے زیادہ وہ ثبوت اہم ہیں۔"

عامی نے کہا۔" وہ ثبوت تم سے زیادہ میرے لیے اہم ہیں۔ یوں سمجھو کہ وہ میری زندگی کی گارنٹی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم مجھ سے وفادار رہے تو وہ ثبوت کبھی بھی منظر عام پر نہیں آئیں گے۔"

"میں تم پر کیسے اعتبار کرلوں؟" کرمانی نے سوال کیا۔" تم کسی بھی وقت اُن ثبوتوں کو بنیاد بنا کر مجھے بلیک میل کر سکتے ہو؟"

"اس کا میرے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی زبان پر اعتبار کرنا پڑے گا۔"

"اوکے مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔" کرمانی نے جواب دیا۔

"کتنا وقت؟" اُس نے استفسار کیا۔

''صرف پندرہ بیس منٹ۔'' اُس نے جواب دیا اور پھر کانسٹیبلوں کو آواز دے کر دوبارہ اندر بلالیا۔ ''میں ابھی چند لمحوں کے اندر واپس آتا ہوں۔ تم لوگ اس کا خیال رکھنا۔ بہت تیز اور عیار آدمی ہے۔'' کانسٹیبلوں کو ہدایت دیتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر اُس نے پاشا کا سیل فون نمبر ملایا اور ربط ہوتے ہی بولا۔ ''پاشا صاحب! عماد کے بعد وہ غنڈہ عامی بھی اس وقت میرے نرغے میں ہے مگر میں دونوں کو ایک ساتھ ٹھکانے نہیں لگا سکتا۔ اُن میں سے ایک کو جیل بھیجنا پڑے گا۔ لیکن..... میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کس کو ٹھکانے لگائے جائے اور کس کو جیل بھیجا جائے؟''

پاشا نے کہا۔ ''کرمانی! تم بہت ہی کند ذہن انسان ہو، مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تمہیں کس اُلو کے پٹھے نے پولیس فورس میں بھرتی کرلیا؟''

''اسی لیے تو جناب آپ سے مشورہ مانگ رہا ہوں۔'' اُس نے بُرا مانے بغیر جواب دیا۔

''بالکل گدھے ہو تم...... احمق انسان! عماد کو پولیس مقابلے میں ہلاک کروا دو اور عامی کو جیل بھیج دو لیکن یہ خیال رہے کہ عماد کو تم نے مارنے کے بعد عامی ظاہر کرنا ہے جب کہ عامی کو عماد بنا کر جیل بھیج دو۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔''

وہ بولا۔ ''جناب! آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن عامی کے پاس ہم دونوں کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ وہ جیل سے باہر آکر ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔ ہمیں خوب سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا ہوگا۔''

''تو پھر اُسے ہی ٹھکانے لگا دو، عماد کا میں خود ہی کوئی بندوبست کرلوں گا۔''

''مسئلہ تو یہی ہے جناب! کہ میں اُسے ٹھکانے بھی نہیں لگا سکتا۔'' کرمانی نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' پاشا جھنجلا گیا۔ ''تم اُسے ٹھکانے کیوں نہیں لگا سکتے؟''

''اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اُسے کچھ ہوا تو ہمارے خلاف ثبوت کسی نامعلوم ذرائع سے میڈیا تک پہنچ جائیں گے۔''

''ہوں...... اس کا مطلب ہے کہ اُس غنڈے کو زندہ رکھنا ہماری مجبوری ہے؟''

”ہاں……جب تک اُس کے پاس ہمارے خلاف ثبوت موجود ہیں ہم اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔“

”نہیں کرمانی!“ پاشا بولا۔ ”ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وقتی طور پر انسان کو کوئی حل نہیں سوجھتا۔“

”میرا تو سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ آپ ہی اس مسئلے کا کوئی مناسب حل نکالیں تاکہ میں چین کی نیند سو سکوں۔“ کرمانی نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔ پاشا چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا جب کہ کرمانی بے چینی سے اُس کے بولنے کا منتظر تھا۔

”اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کرمانی۔“ ذرا دیر کے بعد پاشا کی آواز سنائی دی۔ ”تم اُسے عماد بنا کر جیل بھیج دو، میں کچھ ایسا بندوبست کروں گا کہ وہ زندگی بھر جیل سے باہر نہیں آ سکے گا۔ جیل میں ہی مر کھپ جائے گا۔“

”میں……میں سمجھا نہیں پاشا صاحب! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ اُس نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

پاشا نے کہا۔ ”کیا تمھیں معلوم ہے کہ جیل میں بند اگر کسی قیدی کی فائل گم ہو جائے تو اُس کا کیا بنتا ہے؟“

”اوہ……ویری گڈ پاشا صاحب! میں سمجھ گیا۔“ وہ پُرمسرت لہجے میں بولا۔ ”اگر ایسا ہو جائے تو عامی کبھی بھی جیل سے باہر نہیں آ سکے گا۔“

”سمجھو ایسا ہو گیا، تم بس اُسے جلد سے جلد جیل بھجوا دو۔ باقی سب کچھ میں دیکھ لوں گا۔“ پاشا نے پُر یقین انداز میں جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆……☆……☆

عامی گزشتہ تین ماہ سے جیل میں بند تھا مگر اُسے ایک بار بھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ یہ تین ماہ اُس نے جیل کے حوالات میں کاٹے تھے۔ حوالات میں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جو پولیس کے ریمانڈ پر ہوتے ہیں یا پھر اُن کے کیس عدالتوں میں زیرِ سماعت ہوتے ہیں۔ تین ماہ کے بعد عامی کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے حوالات سے نکال کر جیل کی ایک بارک میں شفٹ کر دیا گیا۔ انھیں دنوں ایک سینئر قیدی سے اُس کی دوستی ہو گئی جو دوہرے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ قیدی کا نام بہاول خان تھا اور وہ سہراب گوٹھ کا رہائشی تھا۔

”عامی بیٹے! تمھیں کس جرم میں اور کتنی سزا ہوئی ہے؟“ ایک دن بہاول خان نے اُس سے پوچھا۔

وہ بولا۔ "چاچا! جرم تو میں نے بہت بڑے بڑے کیے ہیں مگر سزا کا تاحال کوئی پتا نہیں ہے۔ ابھی تک تو مجھے عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔"

"یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟" بہاول خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "عدالت جب تک کسی مجرم کو سزا نہیں سنا دیتی تب تک اُسے جیل کے حوالات میں ہی رہنا پڑتا ہے۔ جب کہ تم یہاں سزا یافتہ قیدیوں کی بارک میں رہ رہے ہو......... پتا کرو بھئی! یہ کیا چکر ہے؟"

"کیسے اور کس سے پتا کروں چاچا؟" اُس نے پریشان ہوکر سوال کیا۔

"جیلر سے بھئی......اور کس سے پتا کروگے؟" بہاول خان نے جواب دیا۔

وہ بولا۔ "چاچا! میں پہلی بار جیل میں آیا ہوں۔ مجھے یہاں آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ جیلر سے بھلا مجھے کون ملنے دے گا؟"

"کیوں نہیں ملنے دے گا......... میں ملاؤں گا تجھے جیلر سے، جیل کے ریکارڈ روم میں ہر قیدی کی اپنی فائل ہوتی ہے، جس میں قیدی کی تصویر، جرم اور دیگر معلومات ہوتی ہیں۔ وہاں تمہاری بھی فائل موجود ہوگی۔"

"بہت بہت شکریہ چاچا میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

"کوئی بات نہیں تم میرے بیٹے جیسے ہو۔" بہاول خان نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے جواب دیا۔

وعدے کے مطابق بہاول خان دوسرے دن اُسے جیل سپرینٹنڈنٹ کے آفس میں لے گیا اور سارا واقعہ جیل سپرینٹنڈنٹ کو سنا دیا۔ جیل سپرینٹنڈنٹ نے سرتاپا عامی کا بغور جائزہ لیا اور پھر افسرانہ شان سے سوال کیا۔ "اپنا پورا نام اور جرم بتاؤ؟"

"عامر شفیق عرف عامی ولد محمد شفیق، جرم تین سو دو۔" اُس نے بلا جھجک جواب دیا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" سپرینٹنڈنٹ نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ "عامر شفیق تو ایک مشہور ٹارگٹ کلر تھا۔ جو تین ماہ قبل پولیس مقابلے میں انسپکٹر اسلم کرمانی کی گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہوچکا ہے۔"

یہ خبر عامی کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ لمحہ بھر کے لیے تو اُس کے اعصاب ہی جواب دے گئے تاہم پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ میں زندہ ہوں...... یہ دیکھو......... آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

سپرینٹنڈنٹ بولا۔ "مجھے تو تم پاگل لگتے ہو........ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تم عامر شفیق ہو؟"

"یہی سوال میں بھی آپ سے کرسکتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں عامر شفیق نہیں ہوں؟"

"ابھی دکھاتا ہوں۔" اُس نے سر ہلایا اور پھر ایک چوبی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کے پٹ کھول کر اُس نے ایک خانے سے پُرانے اخبارات کا بنڈل نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا اور پھر اُنھیں ایک ترتیب سے چیک کرنے لگا۔ ذرا دیر کے بعد اُس نے تین مختلف اخبارات نکالے اور عامی کے سامنے ٹیبل پر پھینکتے ہوئے بولا۔ یہ رہے ثبوت، اچھی طرح چیک کرلو۔ ان اخبارات میں نہ صرف عامر شفیق کی تصویریں موجود ہیں بلکہ پولیس مقابلے کی تفصیل بھی درج ہے۔"

عامی نے تینوں اخبار باری باری چیک کیے۔ اُن میں عامی کی ہلاکت کے بعد کی خون آلود تصویریں بھی موجود تھیں اور ایک کونے میں اُس کی فائل فوٹو بھی لگی ہوئی تھی۔ بلا شک وشبہ وہ اُسی کی تصویریں تھیں۔ لیکن اُس کا دل یقین کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کہیں کوئی گڑبڑ تھی جو اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ اس سازش کے پیچھے انسپکٹر کرمانی اور سلیمان پاشا کا ہاتھ ہے مگر یہ اخبارات میں موجود اُس کی تصویریں اور ہلاکت کی خبریں اُس کے حلق سے نہیں اتر رہی تھیں۔ وہ بھلا اُس کی ایسی تصویریں کس طرح بنا سکتے تھے؟........ یقیناً وہ اور کوئی اور تھا جسے اُس کی جگہ قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔ شاید اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ بیچارا عامی کا ہم شکل تھا۔

تینوں اخبار اچھی طرح چیک کرنے کے بعد وہ بولا۔ "سر! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ہی عامر شفیق ہوں۔ یہ شخص جسے انسپکٹر کرمانی نے پولیس مقابلے میں ہلاک کیا ہے یہ کوئی اور ہے۔ پلیز میرا یقین کریں۔"

"تو........ میں نہیں مان سکتا۔" سپرینٹنڈنٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "عامر شفیق مر چکا ہے۔"

"اوکے تو پھر میں کون ہوں؟" اُس نے سوال کیا۔

"یہ تو تمہیں پتا ہوگا کہ تم کون ہو؟" سپرینٹنڈنٹ نے جواب دیا۔

"میں نے تو بتا دیا ہے کہ میں عامر شفیق ہوں۔ آپ ہی نہیں مان رہے۔"

"ماننے والی بات ہو تو مانوں نا؟"

"ٹھیک ہے تو پھر جیل کے ریکارڈ روم سے میری فائل منگوائیں، مجھے پتا تو چلنا چاہیے کہ میں کون ہوں کس

جرم میں جیل میں ہوں اور مجھے کتنی سزا ہوئی ہے؟"

"کیا تم واقعی اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟" اس نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

عامی بولا۔ "جانتا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم کل پتا کرنا تب تک میں ریکارڈ روم سے تمہاری فائل منگوا لوں گا لیکن..............."

"لیکن کیا سر؟" عامی نے بے چینی سے پوچھا۔

"نام والا مسئلہ ہے۔ ہر فائل پہ قیدی کا نام و پتا درج ہوتا ہے۔ تمہاری فائل ہم کس نام سے ڈھونڈیں گے؟"

"نام تو میرا عامر شفیق ہی ہے سر! اب اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"ایک نام کے ہزاروں آدمی ہوتے ہیں جناب! مجھے یقین ہے کہ اس کی فائل مل جائے گی۔" بہاول خان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ فائل تلاش کرنے کا حکم تو صادر فرمائیں، سب کچھ سامنے آ جائے گا۔"

"اوکے........ یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" سپرینٹنڈنٹ نے سر ہلایا اور وہ دونوں سلام کرتے ہوئے آفس سے باہر نکل گئے۔

وہ دوسرے دن جیل سپرینٹنڈنٹ کے آفس میں پہنچے مگر وہ آفس میں موجود نہیں تھا۔ سو ناکام لوٹ آئے۔ لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد انھیں سپرینٹنڈنٹ تو مل گیا مگر عامی کی فائل باوجود کوشش کے نہ مل سکی۔ جیل سپرینٹنڈنٹ کے کہنے کے مطابق ریکارڈ روم کے عملے نے سارا ریکارڈ روم چھان مارا تھا مگر انھیں نہ تو کسی فائل میں عامر شفیق کا نام ملا تھا اور نہ ہی کسی فائل میں اس کی تصویر ملی تھی۔ تب عامی نے جیل سپرینٹنڈنٹ سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی تو وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ میرا نہیں بلکہ عدالت کا کام ہے۔"

"تو پھر مجھے عدالت میں پیش کیجیے سر۔" وہ ملتمس ہوا۔ "یہ میری شناخت کا مسئلہ ہے۔"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے۔" سپرینٹنڈنٹ نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہ تمہارے نام کا پتا ہے، نہ جرم کا۔ تم خود سوچو میں تمہیں کس طرح عدالت میں پیش کر سکتا ہوں؟"

''تو پھر مجھے رہا کر دیں.........جب میرے متعلق یہاں کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے تو پھر مجھے قید میں رکھنے کا کیا جواز بنتا ہے؟''

وہ بولا۔''یہ بھی میرے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔میں نہ کسی کو قید میں رکھ سکتا ہوں اور نہ سزا ختم ہونے سے قبل رہا کر سکتا ہوں۔''

''لیکن ہر قیدی کی سزا کا تعین بھی تو ہوتا ہے۔میں یہاں کب تک قید رہوں گا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔اس سلسلے میں تمہارے رشتہ دار ہی کچھ کر سکتے ہیں۔''

''مگر میرا تو کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔'' اُس نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔''تو کیا میں مرتے دم تک جیل میں ہی رہوں گا؟''

وہ بولا۔''میں صرف وزیرِ جیل خانہ جات کو چٹھی بھیج سکتا ہوں۔اس کے علاوہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔'' وہ ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔☆

☆......☆......☆

بہت دنوں تک عامی وزیرِ جیل خانہ جات کی چٹھی کا منتظر رہا۔مگر چٹھی نے نہ آنا تھا نہ آئی۔اب وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔لہٰذا فرار کے منصوبوں پر غور کرتا رہتا تھا۔اس دوران ایک سال کا عرصہ بیت گیا لیکن وہ بے شناخت ہی رہا۔بارک کے قیدی اُسے عامی کے نام سے ہی جانتے تھے مگر خود وہ مشکوک ہو چکا تھا۔اُسے لگتا تھا جیسے وہ عامی نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے۔کوئی ایسا شخص جس کی یادداشت گم ہو چکی ہے۔وہ افسردہ اور بے زار سا رہنے لگا تھا۔بہاول خان خلوص دل کے ساتھ اُس کی دلجوئی میں لگا رہا اور پھر ایک دن بہاول خان کے اصرار پر اُس نے اُسے اپنی آپ بیتی من و عن سنا دی۔کوئی ایک واقعہ بھی اُس نے پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔

اُس کی آپ بیتی سننے کے بعد بہاول خان بولا۔''مجھے لگتا ہے تمہارے خلاف بہت بڑی سازش کی گئی ہے اور اس سازش میں انسپکٹر کرمانی اور سلیمان پاشا ہی ملوث ہیں۔''

وہ بولا۔''یہ تو میں جانتا ہوں چاچا لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ انھوں نے اتنی بڑی سازش رچائی کس طرح؟''

’’تم سے ملتا جلتا کوئی قربانی کا بکرا اُنھوں نے ڈھونڈ لیا ہوگا۔‘‘ بہاول خان نے جواب دیا۔
’’نہیں چاچا!‘‘ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔’’ چکر کوئی اور ہے اخبارات میں جو تصویریں چھپی ہیں وہ سو فی صد میری ہی ہیں۔‘‘
’’ہو سکتا ہے وہ تمہاری ہی تصویریں ہوں۔ پیسے کے دم پر اس ملک میں کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ خریدار کم ہیں جب کہ بکنے والے دکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔ پیسے کی خاطر ایمان تک بیچ دیتے ہیں لوگ۔‘‘
’’چاچا! مجھے لگتا ہے میں جیل سے زندگی بھر نہیں نکل پاؤں گا۔‘‘ اُس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا۔ مرنے کے بعد یقیناً مجھے لاوارث سمجھ کر دفنا دیا جائے گا۔‘‘
’’میں تجھے ایک مشورہ دیتا ہوں، کیا مانو گے؟ بہاول خان نے پوچھا۔
’’ضرور مانوں گا چاچا! آپ حکم کریں؟‘‘
’’عامی! تم پانچ وقت کی نماز پڑھا کرو اور ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری رہائی کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ اُس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ وہ سب کی سنتا ہے چاہے کوئی نیک ہو یا گناہ گار، بس شرط یہ ہے کہ اُسے دل سے پکارے تب وہ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔‘‘
’’ہاں چاچا۔‘‘ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔’’اب تو بس اُسی کا آسرا ہے ورنہ تو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔‘‘
’’وہ بڑا کارساز ہے تاریکیوں کو اُجالوں میں بدل دیتا ہے۔ تم اُسے پکار کر تو دیکھو۔‘‘
بہاول خان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اُس نے خود کو یکسر بدل ڈالا اور اللہ تعالیٰ سے لو لگالی۔ نماز اور ذکر میں اُسے وہ سکون ملا کہ اُس نے قید کے دن شمار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اس دوران مزید چھ ماہ بیت گئے مگر وہ خوش و خرم تھا۔ اُسے اب اس لامتناہی قید کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔
اُس کی روٹین تھی کہ وہ عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو جایا کرتا تھا گو کہ اُس کے ساتھی قیدی شور مچائے رکھتے تھے لیکن وہ ذکر کرتے کرتے بڑے سکون کے ساتھ نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا۔ اُس رات بھی وہ حسب معمول عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد فرشی بستر پر دراز زیرِ لب ذکر کرتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب

کہ دیگر قیدی شور وغل میں مصروف تھے۔ کوئی اپنی بے سُری آواز میں فحش گانا گا رہا تھا تو کوئی چرس بھرے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اُس کا بستر بہاول خان کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا تاہم بہاول خان دیر سے سونے کا عادی تھا۔ عامی کی ابھی پوری طرح آنکھ نہیں لگی تھی کہ جیل میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ جیل کا عملہ حواس باختگی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔ سائرن کی آواز بھی گونج رہی تھی۔ بارک کے اس ہال نما کمرے میں جتنے بھی قیدی تھے وہ دوڑ کر بند دروازوں پر جا کھڑے ہوئے۔ سب قیدی ماجرا جاننے کے لیے بے چین تھے۔

عامی بھی اپنے بستر سے اُٹھا اور قیدیوں کے ساتھ اُلجھتا ٹکراتا دروازے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران بارک کے کمروں کے دروازے کھلنے لگے اور قیدی بارک کے دالان میں اکٹھے ہونے لگے۔ چند لمحوں کے اندر ہی اُن کے کمرے کا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ بھاگتے ہوئے کمرے سے نکلے تو تب اُنھیں ایک بارک میں آگ کے شعلے اُٹھتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ بارک اُن کی بارک سے کافی فاصلے پر واقع تھی۔ جونہی تمام قیدی دالان میں اکٹھے ہوئے تو اُنھیں ایک انسپکٹر نے جیل سپرنٹنڈنٹ کا حکم سنایا۔ ''تمام قیدی بالٹیاں، کنستر یا جو بھی برتن اُنھیں میسر ہے۔ فوراً اُٹھائیں اور پانی لے کر آگ بجھانے کی کوشش کریں۔ یاد رکھنا اگر کسی قیدی نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کی تو اُسے گولی ماردی جائے گی۔ جیل کو چاروں طرف سے مسلح فورس نے گھیر رکھا ہے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی ابھی پہنچ جائیں گی۔''

سب قیدی حکم کی تعمیل میں دوبارہ بھاگتے ہوئے اپنے اپنے کمرے میں گھس گئے اور بالٹیاں اور خالی کنستر لے کر پانی لینے کے لیے واٹر ٹینکی کی طرف دوڑ پڑے جہاں ایک بڑے سائز کا تالاب بنا ہوا تھا۔ یہ تالاب قیدیوں کے نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے بنایا گیا تھا۔ عامی نے بھی ایک بالٹی اُٹھائی اور کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ معاً کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ چاچا بہاول خان تھا، جس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ طاری تھی۔

''کیا بات ہے چاچا؟'' اُس نے قدرے تحیر سے پوچھا۔ ''کیا بالٹی چاہیے؟''

''احمق انسان! بالٹی پھینک دو اور ادھر آؤ، ایسا نادر موقعہ تمھیں دوبارہ نہیں ملے گا۔'' بہاول خان نے پُرجوش

لہجے میں جواب دیا۔

"کک......کیسا موقعہ چاچا؟" اُس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"یہاں سے نکلنے کا......اور ابھی زیادہ سوال وجواب مت کرو، جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔تمہارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔"

عامی نے بالٹی پھینک دی بہاول خان کے ساتھ چل پڑا۔ بہاول خان سیدھا اپنے لاکر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔جیل میں ہر قیدی کے پاس دیوار میں پیوستہ ایک الماری نما فولادی لاکر ہوتا ہے جس میں قیدی اپنا ذاتی سامان اور نقدی وغیرہ رکھتا ہے۔ بہاول خان نے لاکر کھولا اندر سے ایک شاپنگ بیگ نکالا اور عامی کے حوالے کرتے بولا۔"اس میں پولیس کی وردی موجود ہے۔باتھ روم میں جا کر اسے پہن لو......شاباش دیر مت کرو، رات کے وقت اس افراتفری کے عالم میں کوئی بھی تجھے نہیں پہچان سکے گا۔مجھے یقین ہے کہ جب فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اندر آئیں گی تو اُس وقت تمہیں باہر نکلنے کا موقع مل جائے گا۔"

عامی کا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔اُس نے تیزی سے بہاول خان کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ جھپٹا اور دوڑتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔پانچ منٹ کے اندر ہی جب وہ باتھ روم سے نکلا تو ایک ہینڈسم پولیس مین نظر آ رہا تھا۔ بہاول خان نے اُس پر ایک ستائشی نظر ڈالی اور بولا۔"بہت خوب تم واقعی ایک سپاہی نظر آ رہے ہو۔"

"ہاں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔" اُس نے ہنس کر جواب دیا۔

"تم بس پُراعتماد رہنے کی کوشش کرنا کوئی تم پر شک نہیں کر سکے گا......چلو اب نکلو اور جیل کے صدر دروازے کی طرف بڑھنا شروع کر دو۔"

وہ آگے بڑھ کر بہاول خان سے لپٹ گیا۔"مجھے معلوم ہے چاچا! یہ وردی آپ نے اپنے فرار ہونے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔" وہ ممنون انداز میں بولا۔"میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

"تم وقت ضائع کر رہے ہو بیٹے! شاباش جلدی کرو۔" وہ اُس کی پشت تھپکتے ہوئے الگ ہو گیا۔

"میرے لیے دعا کرنا چاچا۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور پھر باہر نکل گیا۔

ایسے ہی وقت فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے اور عامی اندھا دھند جیل کے صدر

دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

☆......☆......☆

ظہیر صدیقی کو نوجوان بیٹے کی موت نے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ تو اُس نے پولیس کے ساتھ عماد کی موت کے سلسلے میں قانونی جنگ لڑی تھی مگر عدالت کے سامنے اُس کے وکیل کے کم زور دلائل نہیں چل سکے تھے۔ عماد کی شکل چونکہ سوفی صد عامی ٹارگٹ کلر سے ملتی تھی، اس لیے عدالت کے پاس کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ چنانچہ چند پیشیوں کے بعد وہ کیس ہار گیا تھا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق پولیس مقابلے میں مارا جانے والا شخص عماد نہیں بلکہ مشہور ٹارگٹ کلر عامر شفیق عرف عامی تھا۔ جب کہ عماد کو عدالت نے گم شدہ قرار دے دیا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ سال سے کوشش کرنے کے باجود وہ عماد کو بھلا نہیں پایا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ عماد کی موت کے پیچھے سلیمان پاشا کا ہاتھ ہے لیکن وہ سلیمان پاشا کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ ایک کم زور اور عام سا شخص تھا جب کہ پاشا کراچی جیسے انڈسٹریل شہر میں کئی فیکٹریوں کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ اُس کی پہنچ اسلام آباد کے ایوانوں تک تھی۔ چند وفاقی منسٹرز سے تو اُس کے گہرے تعلقات تھے کہ اُنھیں اقتدار کے ایوانوں تک پہنچانے میں اُس کی دولت کارفرما تھی۔ سو ایسے طاقت ور شخص سے پنگا لینا ظہیر صدیقی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے سب کچھ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا تھا کہ اُس سے بڑا منصف کوئی نہیں تھا۔

اُس رات عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد ہی وہ سو گیا تھا۔ چونکہ عماد کی موت کے بعد اُسے بے خوابی کی شکایت رہنے لگی تھی، اس لیے وہ خواب آور گولیاں استعمال کرتا رہتا تھا۔ بغیر گولی لیے اُسے کبھی نیند نہیں آتی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں نائیٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحے تو وہ بے حس وحرکت بستر پر پڑا آنکھ کھلنے کے سبب پر غور کرتا رہا، پھر نظر کا چشمہ لگاتے ہوئے وہ اُٹھا اور ٹیوب لائیٹ آن کرنے کے بعد کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایسے ہی وقت اُسے کچن میں کسی برتن کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً محتاط ہو گیا۔ کچن کا دروازہ وہ ہمیشہ بند کر کے سوتا تھا۔ برتن گرنے کا مطلب تھا کہ کچن میں کوئی موجود ہے۔ عماد کی موت کے بعد اُسے ویسے ہی زندہ رہنے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اُس نے موت سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید وہ اب تک موت کو گلے لگا چکا

ہوتا۔ اُس نے ٹیبل کی دراز سے لوڈڈ ریوالور نکالا اور محتاط قدموں سے کچن کی طرف بڑھنے لگا۔ کچن کی لائیٹ جلتی دیکھ کر اُس کا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ کچن میں کوئی موجود ہے۔

وہ بلی کی طرح دبے قدموں چلتا ہوا کچن میں داخل ہوگیا۔ اندر ایک شخص پولیس یونی فارم پہنے موجود تھا، اُس کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ گیس کے چولہے پر کوئی چیز گرم کرنے میں مصروف تھا۔ اُسے ظہیر صدیقی کی آمد کی خبر ہی نہیں ہوسکی تھی۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ظہیر صدیقی نے ریوالور تانتے ہوئے درشت انداز میں پوچھا۔

اجنبی اُس کی آواز سن کر بوکھلا کر پلٹا اور اُس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لیے۔ ظہیر صدیقی کی نظر جونہی اُس کے چہرے پر پڑی تو اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کے سامنے عماد پولیس کی وردی میں ملبوس کھڑا ہوا تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی جگہ خوف تھا۔ وہ اگر عماد ہوتا تو اُسے دیکھ کر یوں خوف زدہ کیوں ہوتا؟ ابو کہہ کر اب تک اُس سے لپٹ چکا ہوتا۔ چند لمحے تو ظہیر صدیقی کسی ٹرانس کے زیر اثر اُسے دیکھتا رہا لیکن جلد ہی وہ حقائق کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس کے سامنے کھڑا یہ شخص سوفی صد وہی ٹارگٹ کلر تھا۔ جسے کے حصے کی موت اُس کے بے گناہ بیٹے کا مقدر بن گئی تھی۔

''تم عامر شفیق عرف عامی ہی ہو ناں؟'' اس بار ظہیر صدیقی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہاں........ ہاں میں........ عامی ہی ہوں........ مگر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟'' اُس نے حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں جواب دیا۔

''بہت لمبی کہانی ہے۔'' وہ ذو معنی انداز میں بولا۔ ''جب کہ تم بھوکے ہو پہلے کچھ کھا لو، پھر تمہیں پوری کہانی سناؤں گا۔''

''سوری۔'' اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں انتہائی مجبوری کے عالم میں آپ کے گھر میں داخل ہوا ہوں، دراصل........''

''میں نے کہا ناں! کہ تم بھوکے ہو، پہلے کھانا کھا لو۔ اس کے بعد میں تمہاری کہانی بھی ضرور سنوں گا۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' ظہیر صدیقی نے طنزیہ انداز میں اُس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

وہ شکریہ کہہ کر دوبارہ چولہے کی طرف متوجہ ہو گیا، جس پر رکھا ہوا کھانا گرم ہو چکا تھا۔ اُس نے کھانا نکالا اور پھر وہیں ایک چوبی اسٹول پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس دوران ظہیر صدیقی اُسے بغور دیکھتا رہا۔ ریوالور بدستور اُس کے ہاتھ میں تھا جس کا رخ عامی کی طرف تھا۔ اُس کی کسی بھی غلط حرکت پر وہ گولی چلانے کے لیے تیار تھا۔ ذرا دیر کے جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا تو ظہیر صدیقی سے بولا۔ ”آپ کو مجھ سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے آپ پلیز یہ ریوالور ہٹا لیں۔“

”خطرہ مجھے نہیں تجھے ہے۔“ ظہیر صدیقی نے اُسے گھورا۔ ”تمہیں اس گھر میں تمہاری شامتِ اعمال لے کر آئی ہے۔“

”مم...... میں سمجھا نہیں...... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟...... دیکھیے! میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔ بلکہ میں تو کسی پناہ گاہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔“

صدیقی بولا۔ ”جو شخص تمہارا نام جانتا ہے کیا وہ تمہارے ماضی سے آگاہ نہیں ہوگا؟“

”مگر میں تو اپنے ماضی کو کب کا دفن کر چکا ہوں۔ اب تو میں ایک بے شناخت سا شخص ہوں جس کا نہ کوئی نام ہے اور نہ ہی پہچان۔“

”اُٹھو۔“ وہ اچانک گرجا اور پھر اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تجھے ماروں گا اور ضرور ماروں گا لیکن اس سے پہلے تجھے تیرا گناہ ضرور بتاؤں گا۔“

عامی چار و ناچار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تب وہ اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ”چلو میں تجھے تیرا گناہ بتاتا ہوں اور وہ بھی تمام ثبوتوں سمیت جنھیں تم چاہتے ہوئے بھی نہیں جھٹلا سکو گے۔“

وہ اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے اپنی خواب گاہ میں لے آیا اور پھر اُسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

”خبردار!! اگر کوئی بھی غلط حرکت کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ چپ چاپ بیٹھے رہنا، ہلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔“

”انکل! شاید آپ کو کوئی غلط فہمی......“

”خاموش ہو جاؤ جلاد کہیں کے۔“ صدیقی گلا پھاڑ کر چلایا تو اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ”اپنی گندی زبان

سے مجھے انکل مت کہو، میں تمہاری موت ہوں۔ سمجھے تم۔"

عامی کو پہلی بار خطرے کا احساس ہوا مگر ایک مسلح شخص کے سامنے وہ کوئی بھی غلط حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ سو دم سادھ کر بیٹھا رہا۔ صدیقی نے آگے بڑھ کر دیوار سے ایک فریم شدہ تصویر اُتاری اور اُسے تھماتے ہوئے بولا۔ "اسے جانتے ہو؟"

عامی نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور متحیر ہو کر کہا۔ "یہ......یہ تو......میری تصویر ہے......آپ کے پاس کیسے پہنچی؟"

"یہ تمہاری تصویر نہیں ہے۔" وہ غرایا۔ "میرے اکلوتے بیٹے عماد صدیقی کی ہے جسے انسپکٹر اسلم کرمانی نے تمہارے شبہے میں مار ڈالا۔ شاید اُس نے ایسا تمہیں بچانے کی خاطر کیا تھا۔ مگر آج تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی بھی نہیں بچا سکے گا۔"

وہ بولا۔ "انکل! میں مانتا ہوں کہ عماد کو میرا ہم شکل ہونے کی وجہ سے جھوٹے پولیس مقابلے میں مار دیا گیا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا ایک موقع نہیں دیں گے؟ اگر آپ کو میری کہانی جھوٹی لگے تو بے شک مجھے گولی مار دینا۔ میں آپ سے رحم کی کوئی بھیک نہیں مانگوں گا۔"

وہ چند لمحوں کے لیے کش مکش کا شکار ہو گیا۔ جیسے دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عامی اُمید بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں پل بھر کے لیے اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر صدیقی خاموشی توڑتے ہوئے بولا۔ "میں تجھے صفائی کا موقع دینے کے لیے تیار ہوں۔ بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "یہ کھیل انسپکٹر کرمانی نے سلیمان پاشا کے ساتھ مل کر کھیلا ہے۔ وہ دونوں آپ کے اور میرے مشترکہ دشمن ہیں۔" اتنا کہہ کر اُس نے اپنی زندگی کی ساری روداد بغیر کسی قطع و برید کے صدیقی کے سامنے بیان کر دی۔

صدیقی نے کہا "میں کیسے یقین کر لوں کہ تم نے سچ کہا ہے۔ تمہاری یہ داستان من گھڑت بھی تو ہو سکتی ہے؟"

”اگر کوئی تیسرا شخص میری اس کہانی کی تصدیق کر دے تو کیا پھر آپ یقین کر لیں گے؟“

”تیسرا کون؟“ اُس نے سوال کیا۔

”انسپکٹر کرمانی۔“

”وہ بھلا تمہارے حق میں گواہی کیوں دے گا؟“ اُس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں کہ میں اُس سے کس طرح گواہی دلواتا ہوں؟“

”شاید تم فرار ہونے کے لیے یہ چکر چلا رہے ہو؟“ اُس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں۔“ عامی نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں آپ سے چاہوں بھی تو دھوکا نہیں کر سکتا۔“

”وہ بھلا کس طرح؟“ اُس نے چونک کر پوچھا۔

”مجھے شناخت چاہیے، جو صرف آپ ہی مجھے دے سکتے ہیں۔“

”کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں؟“ اُس نے حیرت کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ ”سیدھی سی بات ہے عامر شفیق عرف عامی مر چکا ہے جب کہ عماد صدیقی زندہ ہے۔ مجھے عماد صدیقی کی شناخت چاہیے۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے یہ شناخت با آسانی دے سکتے ہیں۔ میں اُس گناہ کی تلافی کرنا چاہتا ہوں جو میں نے کیا ہی نہیں ہے۔“

”میں اپنے بیٹے کے قاتل کو اپنا بیٹا کس طرح بنا سکتا ہوں؟“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”میں پہلے خود کو بے گناہ ثابت کروں گا۔ تب آپ مجھے شناخت دینا۔ اگر میں خود کو بے گناہ ثابت نہ کر سکا تو تب آپ مجاز ہوں گے کہ مجھے گولی مار دیں۔“

وہ ایک بار پھر کشمکش کا شکار ہو گیا۔ اُس کی صورت دیکھ کر دل مچلنے لگا تھا کہ اُسے عماد کا نعم البدل تسلیم کر لیا جائے جب کہ دماغ دل کی مخالفت کرتے ہوئے سمجھا رہا تھا کہ یہ شخص تمہارے بیٹے کا ہی نہیں اور بھی بہت سے معصوم اور بے گناہوں کا قاتل ہے، اسے بیٹا بنانے کی بجائے گولی مار کر اپنا دل ٹھنڈا کر لو۔“

اُسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر عامی بولا۔ ”اگر آپ کو میری نیت پر شک ہے تو پھر سوچنا کیا؟ چلاؤ گولی میرا سینہ حاضر ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ ”مار ڈالو مجھے آپ پر کوئی الزام نہیں آئے

گا۔ پولیس ریکارڈ میں تو مجھے پہلے ہی مردہ قرار دیا جا چکا ہے۔"

وہ ریوالور پھینک کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔" جاؤ تم آزاد ہو، مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔" پھر ایک دم اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

عامی چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر جھجکتے ہوئے آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔" انکل! خدا گواہ ہے کہ عماد کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ تاہم یہ بات میں مانتا ہوں کہ اُسے میرا ہم شکل ہونے کی سزا ملی ہے۔ لیکن آپ خود سوچیں کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔" وہ پہلی بار نرم انداز میں بولا۔" اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ عماد اگر میری بات مان لیتا تو شاید ایسے انجام سے دوچار نہ ہوتا۔ اُسے وعدہ خلافی کی سزا ملی ہے، باپ کی نصیحت نہ ماننے کی سزا ملی ہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا تھا کہ اُس لڑکی سے نہ ملے مگر اُس نے میری ایک بھی نہ مانی۔ خود تو مر گیا لیکن مجھے مر مر کر جینے کے لیے چھوڑ گیا۔"

"یہ......لڑکی کا کیا چکر ہے، کیا عماد کسی کو چاہتا تھا؟" عامی نے سوال کیا۔

"ہاں۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر جو کچھ بھی اُسے معلوم تھا اُس نے عامی کو بتا دیا۔

"تو لڑکی کا نام زارا احمد ہے اور وہ کسی امیر کبیر شخص کی بیٹی ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق وہ امیر شخص سلیمان پاشا ہو سکتا ہے؟"

"سو فی صد وہی ہے۔" اُس نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

عامی لمحہ بھر کے لیے سوچوں میں ڈوب گیا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر ایک دم چونک کر بولا۔

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی بار مجھے دیکھ کر وہ چونک اُٹھا تھا۔ یقیناً اُس نے پہلی نگاہ میں مجھے عماد سمجھا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے......میں بھی تو پہلی نگاہ میں تجھے عماد ہی سمجھا تھا۔"

"آپ چاہیں تو اب بھی مجھے عماد سمجھ سکتے ہیں۔ بے شک میں عماد کی طرح پڑھا لکھا نہیں ہوں مگر آپ کی نافرمانی کبھی نہیں کروں گا۔"

”میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔“
”دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے انکل۔“ وہ پہلی بار مسکرایا اور اُس سے بغل گیر ہو گیا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر اسلم کرمانی سہ پہر تین بجے کے بعد اپنی ذاتی گاڑی میں پولیس اسٹیشن سے باہر نکلا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس وقت وہ یونی فارم کی بجائے عام ڈریس میں تھا۔ اُس کا گھر شہر کی ایک نئی اور مشہور و معروف کالونی میں واقع تھا۔ وہاں زیادہ تر امیر لوگوں کے بنگلے تھے۔ وہ مختلف شاہراہوں اور چوراہوں سے گزرتا ہوا ایک مشہور چوراہے تک پہنچ گیا۔ اکثر اُس چوراہے پر ٹریفک کا بہت زیادہ رش رہا کرتا تھا۔ وہاں ہارنوں اور گاڑیوں کے شور میں کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ چوراہا کراس کرنے ہی لگا کہ اچانک سگنل کی بتی سرخ ہو گئی۔ وہ بریک لگا کر بتی کے سبز ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جونہی سبز بتی جلی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ٹریفک کے اژدہام سے نکل کر وہ ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گیا۔ اسی روڈ پر چند کلومیٹر کے فاصلے پر اُس کا شان دار بنگلا واقع تھا۔ جہاں وہ اپنی خوب صورت بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں گنگناتا ہوا ڈرائیونگ کر رہا تھا کہ معاً اُسے اپنی پشت پر چبھن کا احساس ہوا۔ اُس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایک نقاب پوش ہاتھ میں خوف ناک قسم کا ریوالور پکڑے اُسے گھور رہا تھا۔ نقاب پوش کا تمام چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں، جو انگارے برسا رہی تھیں۔ ریوالور کا رخ انسپکٹر کرمانی کی طرف تھا۔ وہ ایک لمحہ کرمانی کو گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا۔

”اگر تم میری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو محفوظ رہو گے ورنہ دوسری صورت میں مجھے تمہاری کھوپڑی اُڑاتے ہوئے ذرا سا افسوس بھی نہیں ہو گا۔“

نقاب پوش کی آواز کرمانی کو جانی پہچانی لگی۔ اُس نے دماغ پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر اُسے کچھ بھی یاد نہیں آیا کہ یہ آواز اُس نے کب اور کہاں سنی تھی؟ نقاب پوش کے لہجے میں چھپی دھمکی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے اُس پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ سو اُس نے کوئی بھی غلط حرکت کرنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا کہ اسی میں اُس کی بھلائی تھی۔ تاہم وہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں ایک..............“

”حرامی قسم کا پولیس انسپکٹر اور دوست کُش انسان ہوں.........یہی کہنا چاہتے تھے ناں تم؟“ نقاب پوش نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

اُس کی بات سن کر کرمانی کے تن من میں آگ بھڑک اُٹھی۔”میں تجھے اس بدتمیزی کا مزا...........“

”چوپ۔“ نقاب پوش گرجا اور کرمانی ایک دم خاموش ہوگیا۔”اب اگر تم نے میری مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔زندگی پیاری ہے تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔“

اب کرمانی کے لیے اُس کے حکم پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔وہ اُس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ساحلِ سمندر کے قریب واقع ایک بنگلے تک پہنچ گیا۔بنگلے کا مین گیٹ بند تھا۔چنانچہ نقاب پوش کی ہدایت پر کرمانی نے گیٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔نقاب پوش نے گاڑی سے اُترے بغیر جیب سے سیل فون نکالا، کال ملائی اور رابطہ قائم ہوتے ہی بولا۔”انکل! گیٹ کھول دیں، میں شکار لے کر پہنچ گیا ہوں۔“

چند ثانیوں کے بعد گیٹ کھل گیا۔تب نقاب پوش نے کرمانی کو گاڑی اندر لے جانے کا حکم دیا تو اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔گاڑی کو بنگلے کے پورچ میں ٹھہرانے کے بعد نقاب پوش نے کرمانی کو نشانے پر رکھتے ہوئے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔وہ بے چوں چراں نیچے اُترا اور نقاب پوش کے آگے آگے چلنے لگا۔طویل کاریڈور سے گزرتے ہوئے وہ آخری کمرے میں پہنچ کر رک گئے۔اسی دوران ایک اور نقاب پوش کمرے میں داخل ہوا،اُس نے ایک نظر کرمانی پر ڈالی اور مٹھیاں بھینچتا ہوا کمرے کے ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔فرش پر جھک کر اُس نے ایک چوبی تختہ اُٹھایا تو نیچے جسمنٹ کی سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔وہ بلاتردد نیچے اُتر گیا۔کرمانی خوف زدہ نگاہوں سے یہ منظر دیکھتا رہا۔اُسے نقاب پوش سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”چلو نیچے تہہ خانے میں چل کر بات کرتے ہیں۔“ نقاب پوش نے کرمانی کو حکم دیا۔

”پپ.........پلیز.........مم.........مجھے جانے دو۔“ کرمانی نے لرزتی ہوئی آواز میں التجا کی۔

”شاید تم کتے کی موت مرنا چاہتے ہو؟“ نقاب پوش نے ریوالور سیدھا کیا۔”چلو آگے بڑھو ورنہ میں گولی چلانے لگا ہوں۔“

نقاب پوش کے لہجے میں قطعیت تھی۔کرمانی کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھا اور تہہ خانے کی سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔جب کہ نقاب پوش بھی اُس کی تقلید کرتا ہوا پیچھے پیچھے تھا۔نیچے پہنچ کر نقاب پوش نے اُسے ایک کرسی پر بٹھایا، رسی لی اور اُسے مضبوطی سے کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔

''تم......لوگ......مم......میرے ساتھ......ایسا سلوک کیوں کررہے ہو؟'' کرمانی نے فریادی انداز میں پوچھا۔

''تم ایک سانپ ہو کرمانی اور سانپ کا سر کچلنا کوئی جرم یا گناہ نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر نقاب پوش نے نقاب اُتار دیا۔اُس کی شکل دیکھ کر حیرت سے کرمانی کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔اُس کے سامنے مشہور ٹارگٹ کلر عامی کھڑا اُسے خون خوار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''یہ......یہ کیا ہے عامی!......کیا میں نے اس لیے تمہاری جان بچائی تھی کہ تم میرے ہی دشمن بن جاؤ؟''

''تم سچ مچ پاگل ہو گئے ہو کرمانی!'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔''عامی کو تو تم نے خود پولیس مقابلے میں ہلاک کیا تھا۔کیا بھول گئے؟میں تو عماد صدیقی ہوں۔''

''نن......نہیں......مم......میں نے تو عماد کو......پولیس مقابلے میں......ہلاک کیا تھا۔'' اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کیوں مارا تھا اُسے کمینے!'' دوسرا نقاب پوش بھوکے عقاب کی طرح اُس پر جھپٹا اور تہہ خانہ تھپڑوں کی آواز سے گونجنے لگا۔

''میں......تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا......مار ڈالوں گا تجھے......تیرے گندے اور ناپاک جسم کو چیل کوؤں کی خوراک بنادوں گا۔'' اُس پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔اُس کے دونوں ہاتھ میکانکی انداز میں چل رہے تھے، جب کہ کرمانی بے تحاشا چلا رہا تھا۔بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ خود کو بچانے سے قاصر تھا۔

عامی چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔اُسے معلوم تھا کہ اُس کا ساتھی جو کہ ظہیر صدیقی تھا، خود ہی تھک کر کرمانی کو چھوڑ دے گا۔ظہیر صدیقی چند لمحے تو کرمانی کے چہرے پر تھپڑ اور گھونسے برساتا رہا، پھر عامی کی توقع

کے عین مطابق وہ ہانپنے لگا۔ تب عامی آگے بڑھا اور ظہیر صدیقی کو سہارا دیتے ہوئے بولا۔

''بس انکل! اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''نہیں۔'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔'' میں......اسے اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔ تب کہیں جا کر......میرے سینے میں ٹھنڈ پڑے گی۔''

''کبھی نہیں انکل!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' اس کے گندے خون سے میں آپ کو ہاتھ نہیں رنگنے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹے! جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ غیر متوقع طور پر رضا مند ہو گیا۔

''ہاں تو مسٹر کرمانی! کیا خیال ہے؟'' عامی کرمانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔'' کس قسم کی موت مرنا پسند کرو گے؟ میں نے سارا بندوبست کیا ہوا ہے۔ تمہیں بس انتخاب کی زحمت اُٹھانا پڑے گی باقی کام میرا ہے۔''

''کک......کیا......تت......تم......مجھے مار ڈالو گے؟'' خوف سے کرمانی کا رنگ زرد پڑ گیا اور زبان ہکلانے لگی تھی۔

''ہاں......میں چاہوں بھی تو تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''پلیز عامی پلیز......'' وہ گڑگڑانے لگا۔'' تمہیں خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو......میں تمہارے پانچ کروڑ روپے بھی لوٹا دوں گا، بلکہ جتنا کچھ بھی میرے پاس سب تجھے دے دوں گا......پلیز مجھ پر رحم کرو پلیز......''

''انکل ظہیر کو اُس کا بیٹا لوٹا دو، میں تجھے معاف کر دوں گا۔''

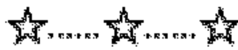
''یہ......یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟'' وہ پھر گڑگڑایا۔'' مم......میں اُسے......کیسے واپس لا سکتا ہوں؟''

''تمہاری چیک بک کہاں ہے؟'' عامی نے ایک غیر متعلق سوال کر دیا۔

''گاڑی میں......ڈیش بورڈ کے اندر رکھی ہے۔'' اُس نے فوراً جواب دیا شاید دل ہی دل میں اُس نے کوئی اُمید باندھ لی تھی۔

''انکل! یہ ریوالور لو اور اس پر نظر رکھنا، میں گاڑی سے چیک بک نکال کر لاتا ہوں۔'' عامی نے ظہیر صدیقی کی طرف ریوالور بڑھایا۔

”نہیں چیک بک لے کر میں آتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔



کرمانی کا دایاں ہاتھ آزاد تھا اور وہ چیک فل کرنے کے بعد سائن کر رہا تھا کہ اُسی وقت اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے سائن کرنے کے بعد چیک عامی کی طرف بڑھا دیا اور پھر اُسے اُمید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ عامی نے اس کی جیب سے سیل فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی تو کسی شبانہ کرمانی کا نام دکھائی دیا۔

”شبانہ کرمانی کا فون ہے۔ کون ہے یہ........ بیگم یا گرل فرینڈ؟“ اُس نے کرمانی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔ اس دوران فون بجنا بھی بند ہو گیا۔

”م........ میری بیوی ہے۔“

”ٹھیک ہے اسے بتا دو کہ تم ایک دو دن تک گھر نہیں پہنچ سکو گے، کسی سرکاری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے ہو۔ اس کے علاوہ تم نے مزید اُس سے کچھ بھی نہیں کہنا اور نہ ہی کسی قسم کی چالاکی دکھانی ہے ورنہ مجھے ایک سیکنڈ لگے گا اور تم لاش میں تبدیل ہو جاؤ گے۔“

”م........ میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔“ کرمانی نے میکانکی انداز میں جواب دیا۔

عامی نے اثبات میں سر ہلایا اور شبانہ کرمانی کو کال بیک کرنے لگا۔ جونہی رابطہ ہوا اُس نے اسپیکر آن کرتے ہوئے فون کرمانی کی طرف بڑھا دیا۔

”ہیلو........“ اُس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کرمانی! آپ کب تک پہنچ جائیں گے؟“ بیگم نے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ”میں دو دنوں تک گھر نہیں پہنچ سکوں گا۔ شہر سے باہر گیا ہوا ہوں ایک سرکاری کام ہے۔“

”ٹھیک ہے تو کیا میں امی کے ہاں چلی جاؤں؟“

”چلی جاؤ، یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے؟“ کرمانی نے جواب دیا۔

”تھینکس کرمانی۔“ بیگم نے پُر مسرت آواز میں کہا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد کرمانی نے عامی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک ماتحت آفیسر کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ

دونوں کے بعد پولیس اسٹیشن پہنچے گا کیونکہ اُسے کوئی گھریلو مسئلہ درپیش ہے۔☆

وہ ساری رات اُنھوں نے کرمانی کے ساتھ تہہ خانے میں گزاردی تھی۔کھانے پینے کا بندوبست اُنھوں نے کرمانی کو اغوا کرنے سے پہلے ہی کررکھا تھا۔چنانچہ تہہ خانے میں رہتے ہوئے اُنھیں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی تھی۔صبح اُنھوں نے پہلے کرمانی کو ناشتا کرایا اور پھر خود کیا۔لگ بھگ صبح کے نو بجے اُنھوں نے کرمانی کو تہہ خانے میں چھوڑا اور خود باہر چلے گئے۔تہہ خانے کا تختہ اپنی جگہ پر لگانے کے بعد عامی نے ظہیر صدیقی کو الرٹ رہنے کی تاکید کرتے ہوئے ریوالور اُس کے حوالے کردیا۔

''انکل! ہوشیار رہنا میں ایک گھنٹے کے اندر لوٹ آؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھا اندرونِ شہر کی جانب گامزن تھا۔یہ ایک چھوٹی سی سوزوکی مہران کار تھی، جو اُسے ظہیر صدیقی نے خرید کردی تھی۔ایک بینک کے سامنے گاڑی روک کر اُس نے ایک درمیانے سائز کا بریف کیس اُٹھایا اور گاڑی کو لاک کرنے کے بعد بینک کے اندر داخل ہوگیا۔بینک میں اُسے تقریباً نصف گھنٹا لگ گیا مگر جب وہ باہر نکلا تو اُس کے بریف کیس میں پانچ کروڑ روپے کی رقم موجود تھی۔انسپکٹر کرمانی سے اُس نے اوپن چیک لیا تھا۔اُس نے گاڑی کو ان لاک کیا بریف کیس ساتھ والی سیٹ پر رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بینک کی عمارت سے باہر آگیا۔اب اُس کا رخ شہر کی ایک معروف مارکیٹ کی طرف تھا۔مارکیٹ میں پہنچ کر اُس نے ایک دکان سے ہینڈ کیری وڈیو کیمرا خریدا اور واپس روانہ ہوگیا۔

جب وہ دوبارہ بنگلے میں داخل ہوا تو اُس وقت ساڑھے دس بجنے والے تھے۔اُس نے پورچ میں جاکر گاڑی روکی، بریف کیس اُٹھایا اور تیزی سے اُس کمرے کی جانب بڑھ گیا جس میں ظہیر صدیقی موجود تھا۔ظہیر صدیقی واقعی کسی فوجی جوان کی طرح الرٹ بیٹھا ہوا تھا۔عامی کو دیکھتے ہی اُس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑگئے۔

''کام ہوگیا ہے انکل۔'' اُس نے بریف کیس لہرایا۔''اس میں پورے پانچ کروڑ روپے کی رقم موجود ہے۔ہم دونوں میرے گاؤں چلے جائیں گے اور وہاں سکون سے زندگی گزاریں گے۔''

وہ بولا۔''ہاں بیٹے! عماد کے بعد اب میرا بھی دل اچاٹ ہوگیا ہے اس شہر سے۔ویسے بھی اب یہ

شہر درندوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ روزانہ کتنی ہی ماؤں کے لختِ جگر اور باپوں کے بڑھاپے کی لاٹھیاں چھین لیتا ہے۔ اب یہاں چاروں طرف موت کا بسیرا ہے۔"

"تو چلیے پھر عماد کے قاتل سے نمٹ لیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے تہہ خانے کا چوبی تختہ ہٹا دیا۔

ایک بار پھر وہ بندھے ہوئے کرمانی کے سر پر موجود تھے۔ ایک ہی رات میں کرمانی کی بُری حالت ہو گئی تھی اور وہ برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔

"کیا حال ہے مسٹر اسلم کرمانی عرف اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ!" عامی نے ریوالور کے ذریعے اُس کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"خدا کے لیے.........مم.........مجھے چھوڑ دو۔" وہ روتی ہوئی آواز میں بولا۔" اب تو میں نے تمہارے پانچ کروڑ روپے بھی لوٹا دیے ہیں۔"

"چھوڑ دیں گے بھئی! اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ پہلے ذرا اپنے دوست پاشا کو تو کال کر کے یہاں بلا لو، اُس کے ذمے بھی اپنا بہت سا حساب کتاب باقی ہے۔ جو مجھے بے باق کرنا ہے۔"

"وہ بھلا یہاں کیوں آئے گا؟" اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

"یہ تجھے میں بتاؤں گا کہ وہ کیسے آئے گا؟" عامی نے ذومعنی انداز میں جواب دیا اور پھر کرمانی کا دایاں بازو رسیوں سے آزاد کرنے لگا۔

کرمانی کا فون عامی کی جیب میں موجود تھا، جسے اُس نے آف کر رکھا تھا۔ اُس نے جیب سے فون نکال کر آن کیا اور پھر فون بک میں جا کر پاشا کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

سلیمان پاشا دیر سے جاگنے کا عادی تھا۔ اُس وقت وہ ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھا جب اچانک اُسے انسپکٹر کرمانی کی طرف سے کال آنے لگی۔ پہلے تو اُس نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔" ہاں کرمانی! صبح صبح تم پر کون سی مصیبت نازل ہو گئی ہے؟"

"پاشا صاحب! کیا آپ اسی وقت اپنے ساحلِ سمندر والے بنگلے پر پہنچ سکتے ہیں؟" کرمانی نے استفسار کیا۔

"تم...... تم وہاں کس طرح پہنچ گئے؟" پاشا کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ "وہ تو ایک عرصے سے بند پڑا ہے اور وہاں صرف ایک چوکیدار رہتا ہے۔"

"دراصل میں عامی اُستاد کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ وہ جیل سے فرار ہو کر آپ کے اس بنگلے میں روپوش تھا۔ اس وقت وہ میرے قبضے میں ہے۔ مجھے لگتا ہے اُس نے ہم دونوں کے خلاف ثبوت اسی بنگلے میں کہیں چھپا رکھے ہیں۔ کیا اس بنگلے میں کوئی تہہ خانہ وغیرہ ہے؟"

کرمانی نے تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں سوال کیا۔

"ہاں ہاں..... بالکل ہے۔" وہ تقریباً اچھل پڑا۔ "میں بس ابھی پہنچتا ہوں، خیال رکھنا وہ نکلنے نہ پائے۔"

"ڈونٹ وری پاشا صاحب! اس وقت وہ کسی کتے کی طرح میرے پیروں میں بندھا پڑا ہے۔ بنگلے کا مین گیٹ کھلا ہوگا آپ بے دھڑک اندر چلے آیئے۔" کرمانی نے فخریہ انداز میں بتا کر رابطہ کاٹ دیا۔

پاشا نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور پھر بغیر ڈرائیور کے ساحلِ سمندر والے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد وہ بنگلے کے مین گیٹ سے گزرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ گاڑی روک کر وہ نیچے اترنے ہی لگا تھا کہ عامی کسی بلائے ناگہانی کی طرح اُس کے سر پر پہنچ گیا۔

"ہاتھ اُوپر پاشا صاحب۔" وہ اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے غرایا۔ "ورنہ بھون ڈالوں گا۔"

"تت...... تم...... وہ...... کرمانی...... کہاں ہے؟" اُس نے اٹکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نیچے تہہ خانے میں پڑا ہوا ہے اور کسی خارش زدہ کتے کے مانند چلا رہا ہے۔ چلو وہ تمہارا منتظر ہے۔"

"دیکھو! تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو...... تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" پاشا نے دھمکی دی۔

"چلتے ہو یا چلاؤں گولی؟" عامی نے ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

اُس کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اگر پاشا نے دوبارہ منہ کھولا تو جواب میں گولی آئے گی۔ سو وہ بلا چوں چراں عامی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے تہہ خانے کے اندر پہنچ گیا۔ وہاں کرمانی ایک کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ پاشا کو عامی نے دوسری کرسی پر بٹھا دیا اور پھر اُس کی جیب سے سیل فون نکال کر آف کرنے کے بعد ظہیر صدیقی کے حوالے کر دیا۔

''پاشا!'' عامی اُسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم نے عماد کو کیوں اور کیسے مروایا تھا؟ اگر تم نے ذرا سا بھی جھوٹ بولا تو میں بلا جھجک گولی چلا دوں گا۔''

پاشا گو کہ بہت بڑا آدمی تھا مگر ایسی صورتِ حال سے اُس کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ چنانچہ ایک ٹارگٹ کلر کے سامنے جلد ہی اُس کے اعصاب جواب دے گئے اور اُس نے فر فر ساری کہانی سنا دی۔

بہت خوب پاشا!'' عامی نے اسے داد دی۔ ''اگر تم اسی طرح تعاون کرتے رہے تو شاید ایک بُری موت مرنے سے بچ جاؤ۔''

''مم......مجھے مت مارنا......میں تعاون کروں گا۔'' پاشا نے فوراً جواب دیا۔

نصف گھنٹے کے اندر عامی ایک ایسی وڈیو فلم فلما چکا تھا کہ وہ اگر کسی چینل سے آن ایئر ہو جاتی تو عوام پاشا کی بوٹی بوٹی کر دیتے۔ وہ بیک وقت انڈین ایجنسی را، اسرائیل کی موساد اور امریکہ کی سی آئی اے کے لیے کام کرتا تھا۔ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ سے لے کر بلوچستان کی خون ریزی تک وہ ملوث تھا۔ اُس کی ساری دولت انہی ایجنسیز کی عطا کردہ تھی۔ جب کہ انسپکٹر کرمانی بھی ان جرائم میں شامل رہا تھا۔

''تم سوچ سکتے ہو پاشا!'' وڈیو فلمانے کے بعد عامی نے کہا۔ ''جب یہ وڈیو کل مختلف چینلز سے آن ایئر ہوگی تو تب تمہارا اور اس کرمانی کا کیا حشر ہوگا؟''

''نن......نہیں......'' پاشا اچانک ہذیانی انداز میں چلایا۔ ''تت......تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔ آج ہی یہ وڈیو مسٹر......صاحب تک پہنچ جائے گی۔'' عامی نے ملک کے ایک مشہور و معروف صحافی کا نام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا سب کچھ لے لو......مگر ایسا مت کرو۔'' پاشا نے اُسے پیش کش کی۔

''مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے پاشا۔'' اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں اب تائب ہو چکا ہوں۔ مجھے نئی شناخت مل چکی ہے۔ میں اب عامی نہیں ہوں عماد صدیقی ہوں اور......''

عامی کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ معاً پاشا نے جیب سے ایک بڑے سائز کا کیپسول نکالا اور پلک جھپکنے کی دیر میں نگل لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی اُس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے کرسی سے لڑھک

کر نیچے پختہ فرش پر جا گرا۔

اس کے بعد کے واقعات نہایت تیزی سے وقوع پذیر ہوئے تھے۔ کرمانی کو عامی کے منع کرنے کے باوجود ظہیر صدیقی نے گولی ماردی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ قاتل کو قتل کرنا جرم ہے نہ گناہ اور کرمانی میرے بیٹے کا قاتل ہے...... سو میں نے جو بھی کیا ہے وہ درست ہے۔ بنگلے سے نکلنے سے قبل عامی وہاں سے اپنی موجودگی کے آثار مٹانا نہیں بھولا تھا۔ عامی نے اُسی دن کوریئر سروس کے ذریعے وہ وڈیو ایک مشہور و معروف چینل کو بھجوادی تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد جب وہ دونوں عامی کے گاؤں جانے کی تیاری کر رہے تھے تو عین اسی وقت دروازے کی کال بیل بج اُٹھی۔ عامی نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔

''جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' عامی نے تعجب سے پوچھا۔

''عماد صدیقی سے۔'' لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''نن...... نہیں......'' وہ ہڑبڑا گیا۔

ایسے ہی وقت ظہیر صدیقی دروازے پر پہنچ کر بولا۔ ''ارے زارا بیٹی تم...... چلو اندر آجاؤ۔''

وہ بولی۔ ''انکل! پہلے اس نقلی عماد صدیقی کو تو راستے سے ہٹائیے۔''

ظہیر صدیقی نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر عامی سے بولا۔ ''راستے سے ہٹو یار! یہ زارا احمد ہے جس کی کہانی میں نے تجھے سنائی تھی۔''

ذرا دیر کے بعد وہ تینوں ایک کمرے میں موجود ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے کہ معاً عامی نے زارا سے کہا۔ ''مس زارا! گو کہ میں عماد صدیقی نہیں ہوں لیکن اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو خوش رکھ سکتا ہوں۔ ویسے بھی انکل نے مجھے بطور عماد صدیقی قبول کر لیا ہے۔''

''تو اور کیا میں یہاں تمہاری شکل دیکھنے کے لیے آئی ہوں؟...... اَن پڑھ گنوار کہیں کے۔'' زارا نے مسکرا کر جواب دیا اور کمرا ظہیر صدیقی کے فلک شگاف قہقہے سے گونج اُٹھا۔

